بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

الجنت

موت کے بعد، طبعی زندگی کا ساز وسامان تو یہاں ہی رہ جائے گا، اور صرف انسانی ذات آگے جائے گی، جس ذات کی نشوونما ہوگئی ہوگی وہ زندگی کی ارتقائی منزل میں داخل ہو جائے گی۔ قرآن کریم کی رو سے یہ جنت کی زندگی ہے۔ ہم سب مسلمانوں کا اس پر ایمان ہے کہ آخرت میں جنت وجہنم کی زندگی ہوگی۔ اس پر ایمان لائے بغیر، ایمان ہی پورا نہیں ہوتا لیکن یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کا عملی Test اس دنیا میں نہیں ہوسکتا۔ مذہب کی دنیا میں یہ نظریہ چل جاتا ہے، لیکن دین کی تو نگاہ حقائق ونتائج پر ہوتی ہے، اس لئے اس کا عملی Test، اس دنیا میں ہونا ضروری ہے تاکہ ہر شخص جان لے کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ جنت اس دنیا کو بھی اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالأَرْضُ (۳/۱۳۲)۔ ایسی جنت جس کی وسعت ارض وسماوات کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (۲۱/ ۵۷)، اس کا عرض زمین وآسمان کے عرض کی مانند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے دو جنتوں کا ذکر کیا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ (۴۶/ ۵۵) جس شخص کو اس بات کا یقین ہے کہ اسے عدالت خداوندی میں حاضر ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے، اس کے لئے دو جنتیں ہیں، ایک اس دنیا کی جنت، ایک اخروی زندگی کی جنت۔ کفار ومشرکین حضورﷺ سے مطالبہ کرتے تھے کہ اگر آپ سچے رسول ہیں تو تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ (۱۷/۹۰)۔ تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہونا چاہئے۔ کفار کے اس اعتراض کے جواب میں فوراً اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ایک باغ کا مطالبہ کرتے ہیں خدا تمہیں اپنے قانون مشیت کے مطابق کئی باغات (جنت) عطا کرے گا۔ اس جنت کو حاصل کرنے کے لئے حضورﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے سخت جان توڑ محنت کی اور وہ جنت اسی زندگی میں حاصل کر لی جس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ خدا تمہیں عنقریب فتح دے گا لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (۴۸/۵) تاکہ وہ مومن مردوں اور عورتوں کو اس جنت میں داخل کرے جن کے نیچے پانی بہہ رہا ہے۔ اس کی مزید تائید میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (۱۶/۴۱)۔ اور جنہوں نے اللہ کے واسطے ہجرت کی، جب کہ ان پر ظلم کیا گیا تھا، تو ہم ان کو دنیا میں بہت اچھا گھر دیں گے۔ یہاں قرآن کریم نے وضاحت فرمادی کہ یہ اس دنیا میں واقع ہوگا۔ اس بات کی مزید وضاحت کے لئے کہ جنت اس دنیا میں بھی ہوتی ہے یہ آیت کریمہ حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے جبکہ ارشاد ہوتا

ہے:وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَاء فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِیْنَ (۳۹/۷۴) اور کہتے تھے کہ لائقِ حمد ہے وہ خدا جس نے ان وعدوں کو اس طرح پورا کیا کہ ہمیں اس ملک کا وارث بنا دیا کہ ہمیں اس جنت میں پورا پورا اقتدار حاصل ہے اور یہ عمل کرنے والوں کا کیسا اچھا اجر ہے اس آیہ کریمہ میں ارض کے لفظ نے ثابت کر دیا کہ وہ اسی دنیا کی جنت ہے۔

یہاں تک گفتگو اصولی و تجریدی تھی۔ لیکن یہ کہ اس جنت کے حصول کا عملی طریقہ قرآن کریم نے کیا بیان فرمایا ہے وہ اس آیہ کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے:إِنَّ اللّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الجَنَّةَ یُقَاتِلُونَ فِیْ سَبِیْلِ اللّهِ فَیَقْتُلُونَ وَیُقْتَلُونَ (۹/۱۱)۔اس میں شک نہیں کہ خدا نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال اس بات پر خرید لئے ہیں کہ ان کی قیمت ان کے لئے جنّت ہے۔ اس وجہ سے یہ لوگ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور مارتے ہیں اور خود بھی مارے جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے جنت کے حصول کا یہ عملی طریقہ بیان کر دیا ہے۔ آیہ کریمہ میں اللہ سے مراد اسلامی نظام کا مرکز ہے۔ جیسے کہ سورہ فتح میں ارشاد ہوتا ہے۔إِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُونَكَ إِنَّمَا یُبَایِعُونَ اللَّهَ یَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَیْدِیْهِمْ (۴۸/۱۰)۔اے رسول جو لوگ تیرے ہاتھ پر اپنی جانیں بیچ رہے ہیں وہ دراصل خدا کے ساتھ اپنا معاملہ کر رہے ہیں۔ دیکھنے کو تو ان کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ حضورﷺ کے اپنے دور میں اللہ سے مراد حضور کی اپنی ذاتِ مبارک تھی کیونکہ آپ خود ہی مرکزِ حکومتِ قرآنیہ تھے آپ کے بعد اس سے مراد اسلامی حکومت کا سربراہ ہے۔ دوسری پارٹی جس سے اشتراء ہونا ہے وہ مومنین ہیں، اور مال برائے فروخت مومنین کے جان و مال۔ مومنین اپنے نفوس و مال کے ذریعے جو چیز خریدتے ہیں وہ الجنتہ ہے۔ اس بیع و شریٰ میں، خریدار سربراہ مملکت، سودا کرنے والے مومنین، فروخت کرنے کا مال مومنین کے جان و مال، تینوں چیزیں مرئی اور Tangible ہیں۔ جو سامنے موجود ہیں۔ اس لئے اس معاملہ کو طے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ البتہ چوتھی چیز جو مومن خریدتے ہیں وہ جنت ہے، جب معاہدہ اس دنیا میں ہو رہا ہے اور معاہدہ کرنے والے اس دنیا میں موجود ہیں تو لازمی بات ہے کہ معاہدہ کا چوتھا جزو، جنت بھی اسی دنیا میں ہمارے سامنے مرئی طور پر بطور ایک حقیقتِ ثابتہ سامنے موجود ہو، اس لئے اس سے مراد آخرت کی حقیقت نہیں ہے۔ اسی لئے اس آیہ کریمہ کی تشریح کرنے سے پیشتر قرآنی آیات کے ساتھ یہ بات ثابت کر دی گئی تھی کہ یہاں جنت سے مراد ارضی جنت ہے۔

ہم اس آیہ کریمہ کو پڑھتے ہیں۔ صدہا بار اس کی تلاوت کرتے ہیں لیکن اس کے عملی پہلو پر کبھی غور نہیں کرتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق صرف صحابہ کرامؓ کے دور سے تھا اور ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مرتبہ جب ہم نے مسلمان ہونے کا دعویٰ کر دیا تو ہم اس معاہدہ کے ازخود اس طرح پابند ہیں کہ اسکی اقالت کی ہمارے پاس کوئی راہ نہیں نکل سکتی اور جس دن ہم نے اس معاہدہ کی تجدید کر کے اس پر عمل شروع کر دیا اس وقت سے ہمارے دن پھرنے شروع ہو جائیں گے۔ اس کے لئے شرط ہے کہ ہم اس آیہ کریمہ کی دینی نقطہ نگاہ سے تشریح کریں اور جنت کا اس دنیا سے بھی کوئی تعلق قرار دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ڈاکٹر انعام الحق﴾

لمعات

میڈیا کے لئے لمحہ فکریہ

ہمارے اس دور کو خصوصی طور پر سیاسی نقطہ نگاہ سے میڈیا کے دور کے نام سے پکارا جا رہا ہے۔ اس کی سند میں وزیر با تدبیر شیخ رشید صاحب کا یہ قول بھی سامنے آتا ہے جس میں انہوں نے ملکی میڈیا کو سیاسی جلسوں کا نعم البدل قرار دیا ہے۔ طلوع اسلام کی تحریک شروع سے ہی ملکی سیاست سے کنارہ کشی کئے ہوئے ہے' اس لئے کسی سیاسی موضوع پر تبصرہ کرنے سے گریزاں رہا ہے بشرطیکہ ان میں سیاسی شخصیات اپنے موضوع کو سیاسی حدود میں محدود رکھتے ہوئے قابلیت کا مظاہرہ کریں۔

پچھلے کچھ عرصہ سے البتہ جناب غلام مصطفیٰ کھر صاحب کا میڈیا میں انٹرویو ہمارے لئے باعثِ تشویش بنا ہوا ہے۔ ان انٹرویوز میں وہ فخریہ اعتراف تواتر سے کر رہے ہیں کہ وہ معلومات بہم پہنچانے کے جھوٹے وعدے کرتے ہوئے اپنے لیڈر کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی جان بچا کر ملک سے فرار ہونے میں کامیاب رہے۔ سیاسی زعماء کی نظر میں اسے قابلِ فخر کارنامہ شمار شاید نہ کیا جا سکتا ہو' لیکن کھر صاحب اسے ہجرت کے تناظر میں سنت کی پیروی پر بار بار اصرار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کھر صاحب میڈیا میں اس بات پر بھی اصرار کر رہے ہیں کہ ان کی متعدد شادیوں کو بھی سنت کی پیروی کے تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان انٹرویوز کے دوران میڈیا والے بھی کھر صاحب کے ان Claims پر کہیں اعتراض فرماتے نظر نہیں آتے بلکہ خاموش رہ کر نیم رضامندی ہی سے سہی کھر صاحب کے Claims کو تقویت دینے کا موجب بنے دکھائی دے رہے ہیں۔

کھر صاحب نے اپنے ان انٹرویوز میں یہ بھی وضاحت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ہجرت بحکم اللہ بذریعہ وحی کی تھی۔ اس بات سے ہم کھر صاحب سے متفق ہیں۔ (۱) قرآن نے اللہ کی وحی کے ذریعے ہجرت کی اصطلاح متعارف کرائی ہے' جسے ہم عام قاری کی یاددہانی کے لئے پیش کرنے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن قرآن کریم نے اسے اپنے خاص معنوں میں استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ایک رسول یا مردِ مومن کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ وہ دنیا میں نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے کوشش کرے۔ وہ جس مقام میں رہتا ہے سب سے پہلے

اپنی اس کوشش کو وہیں سے شروع کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ دیکھے کہ وہاں کی فضا اس نظامِ نو کے لئے سازگار نہیں، تو اسے اپنے پاؤں توڑ کر وہیں نہیں بیٹھے رہنا چاہئے۔ اسے اس زمین کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف چلا جانا چاہئے جہاں کی فضا اس کے مقصد کے حصول کے لئے زیادہ سازگار ہو۔ مومن کسی خاص خطۂ زمین سے پابستہ نہیں رہ سکتا۔ مومن کا جہان ہر کہیں ہے۔ وہ کسی خاص زمین میں زندگی بسر کر کے وہیں مر جانے کے لئے پیدا نہیں ہوتا۔ وہ خدا کی زمین میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اسے جو کچھ چھوڑنا پڑے بلا توقف چھوڑ دینا چاہئے۔ مال و دولت۔ جھوٹی عزت اور قوت۔ رشتہ دار۔ وطن۔ سب کچھ۔ اس ''چھوڑ دینے'' کا نام ھجرۃ ہے اور ایسا کرنے والے کو ''مہاجر'' کہتے ہیں۔ لیکن صرف ''چھوڑ دینا'' ہی نہیں بلکہ اس کے بعد اپنے مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا بھی۔ اسی لئے قرآن کریم میں اکثر ھاجروا و جاھدوا (۲/۲۱۸)۔ اکٹھا آیا ہے۔ ھاجروا صیغہ لا ہے اور اس کے بعد جاھدوا صیغہ الا اگرچہ وہ چھوڑ دینا بھی درحقیقت اسی جدوجہد ہی کا ایک پہلو ہے۔ ہجرت مشکلات سے فرار کا نام نہیں۔ یہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے زیادہ مساعد ماحول کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے۔

ہم کھر صاحب اور میڈیا سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ کھر صاحب کے ملک سے فرار ہونے کی روش کا ہجرت رسول کی مماثلت میں درجِ بالا قرآنی تصور کی روشنی میں جائزہ لیں۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا یہ جو ہجرت ہے یہ فرار ہونا نہیں ہوتا۔ جان بچا کر بھاگنے کا نام نہیں ہوتا۔ بلکہ اقبال کے الفاظ میں۔

ہجرت آئینِ حیات مسلم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

کھر صاحب کی یاددہانی کے لئے یہ وضاحت کرنا بھی مناسب ہوگا کہ جھوٹا وعدہ یا شہادت ہر حالت میں مذموم مقصد لئے ہوتی ہے۔ اس کے لئے قرآن کی واضح ہدایت ہے کہ:

احادیث میں حضرت عائشہؓ سے منسوب متعدد جگہ منقول ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا خلق قرآن تھا۔ اس کی شہادت قرآن میں بھی ملتی ہے کہ:

وَإِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ (۶۸/۴)۔

(اے رسول) یہ حقیقت ہے کہ تو اخلاق انسانیت کے بلندترین مقام پر فائز ہے۔

قرآن کریم سے وضاحت ہوتی ہے کہ قریب قریب ہر رسول کو ہجرت کرنا پڑی۔ حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ میں تو لفظ بھی مہاجر کا آیا ہے۔

وَقَالَ إِنِّیْ مُھَاجِرٌ إِلٰی رَبِّیْ۔ (۲۹/۲۶)۔

اور کہا (ابراہیم نے) میں تو وطن چھوڑتا ہوں اپنے رب کی طرف۔

اور دوسری جگہ ہجرت کے متعلق یوں وضاحت کی۔

وَقَالَ إِنِّیْ ذَاہِبٌ إِلَی رَبِّیْ سَیَہْدِیْنِ۔ (۹۹/۳۷)۔

اور بولا (حضرت ابراہیمؑ) میں جاتا ہوں اپنے رب کی طرف وہ مجھ کو راہ دے گا۔

ہجرت کے اس عمل میں البتہ ایک متعین پروگرام کی شکل نبی اکرم ﷺ کے مشن میں اختیار کی جب حضور ﷺ اور آپ کے رفقاء مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کر کے آئے اور آتے رہے۔

کھر صاحب اور میڈیا سے یہ بھی گذارش ہے کہ وہ ہجرت کی مماثلت کے دعویٰ میں یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ ہجرت کے صلہ میں قرآن سے یہ شہادت بھی مل رہی ہے کہ

إِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُواْ وَالَّذِیْنَ ہَاجَرُواْ وَجَاہَدُواْ فِیْ سَبِیْلِ اللّہِ أُوْلَـئِکَ یَرْجُونَ رَحْمَتَ اللّہِ۔ (۲/۲۱۸)۔

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں وہ امیدوار ہیں اللہ کی رحمت کے۔

فَالَّذِیْنَ ہَاجَرُواْ وَأُخْرِجُواْ مِن دِیَارِہِمْ وَأُوذُواْ فِیْ سَبِیْلِیْ وَقَاتَلُواْ وَقُتِلُواْ لأُکَفِّرَنَّ عَنْہُمْ سَیِّئَاتِہِمْ۔ (۳/۱۹۵)۔

اور پھر وہ لوگ کہ ہجرت کی انہوں نے اور نکالے گئے اپنے گھروں سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور لڑے اور مارے گئے البتہ دور کروں گا ان سے برائیاں۔

الَّذِیْنَ آمَنُواْ وَہَاجَرُواْ وَجَاہَدُواْ فِیْ سَبِیْلِ اللّہِ بِأَمْوَالِہِمْ وَأَنفُسِہِمْ أَعْظَمُ دَرَجَۃً عِندَ اللّہِ وَأُوْلَـئِکَ ہُمُ الْفَائِزُونَ۔ (۹/۲۰)۔

جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے ان کے لئے بڑا درجہ ہے اللہ کے ہاں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ ہَاجَرُوا فِیْ سَبِیْلِ اللَّہِ ثُمَّ قُتِلُوا أَوْ مَاتُوا لَیَرْزُقَنَّہُمُ اللَّہُ رِزْقاً حَسَناً۔ (۲۲/۵۸)۔

اور جو لوگ ہجرت کر آئے اللہ کی راہ میں پھر مارے گئے یا مر گئے البتہ ان کو دے گا اللہ روزی اَحسن۔

یَحْلِفُونَ بِاللّہِ مَا قَالُواْ وَلَقَدْ قَالُواْ کَلِمَۃَ الْکُفْرِ وَکَفَرُواْ بَعْدَ إِسْلاَمِہِمْ وَہَمُّواْ بِمَا لَمْ یَنَالُواْ وَمَا نَقَمُواْ إِلاَّ أَنْ أَغْنَاہُمُ اللّہُ وَرَسُولُہُ مِن فَضْلِہِ فَإِن یَتُوبُواْ یَکُ

خَيْراً لَّهُمْ وَإِن يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّهُ عَذَاباً أَلِيماً فِيْ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِيْ الأَرْضِ مِن وَلِيٍّ وَلاَ نَصِيْرٍ۔ (۴/۷۳)۔

اور جولوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان ان کے لئے بخشش ہے اور روزی عزت کی۔

إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلآئِكَةُ ظَالِمِيْ أَنْفُسِهِمْ قَالُواْ فِيْمَ كُنتُمْ قَالُواْ كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِيْ الأَرْضِ قَالُوَاْ أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُواْ فِيْهَا فَأُوْلَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاء تْ مَصِيْراً۔ (۴/۹۷)۔

وہ لوگ کہ جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے اس حالت مین کہ وہ برا کر رہے ہیں اپنا کہتے ہیں ان سے فرشتے تم کس حال میں تھے وہ کہتے ہیں ہم بے بس تھے۔ اس ملک میں کہتے ہیں فرشتے کیا نہ تھی اللہ کی زمین کشادہ جو ہجرت کر جاتے وہاں سے۔ سو ایسوں کا ٹھکانہ ہے دوزخ اور وہ بہت بری جگہ پہنچے۔

وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُواْ وَالصَّابِرِيْنَ فِيْ الْبَأْسَاء والضَّرَّاء وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔ (۲/۱۷۷)۔

اور پورا کرتے ہیں اپنے اقرار کو جب عہد کریں اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت یہی لوگ ہیں سچے اور یہی ہیں متقی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِيْنَ۔ (۴/۱۳۵)۔

اے ایمان والو قائم رہو انصاف پر۔ شہادت دو اللہ کی طرف کی خواہ خلاف ہو تمہارے نفس (جان) کے یا ماں باپ کے یا قرابت والوں کے۔

وَأَوْفُواْ بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولاً۔ (۱۷/۳۴)۔

اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد کی پوچھ ہوگی۔

اب ہجرت کے قرآنی تصور کی طرح قرآن کے تعددِ ازدواج کا قرآنی نظریہ بھی عام قاری کی یاددہانی کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

درجِ بالا تعددِ ازدواج کے قرآنی تصور کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کی سنت کی پیروی کا دعویٰ صرف اور صرف یتامیٰ کی کفالت گری کے مقصد میں پوشیدہ ہے۔ لہٰذا ہم کھر صاحب کو خود یا پھر میڈیا سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ کھر صاحب کے

سنت کی پیروی کے دعویٰ کو ان مقاصد کے تحت پرکھ کر موازنہ کریں۔ ان اور ان جیسے دعوؤں کی خاموشی کی آڑ میں نیم رضامندانہ تائید سے عام قاری کو قرآن سے متنفر کرنے کا باعث بنانے میں مددگار رہونا خود ان کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

قرآن عام حالات میں صرف ایک بیوی کی اجازت دیتا ہے۔ اگر اس بیوی سے نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو مرد طلاق کے بعد دوسری شادی کرسکتا ہے۔ اس کی موجودگی میں نہیں۔

وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ۔ (۴/۲۰)۔

اور اگر بدلنا چاہو ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی آ سکتی ہے۔ اس کی موجودگی میں نہیں۔

جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رو سے عام حالات میں ایک ہی بیوی کی اجازت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی خاص حالات بھی پیدا ہو سکتے جن میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے ان حالات کی صرف درج ذیل آیت میں خود ہی تصریح کر دی ہے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُواْ فِيْ الْيَتَامَى فَانكِحُواْ مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاء مَثْنَى وَثُلاَثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُواْ فَوَاحِدَةً۔ (۴/۳)۔

اور اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو (ایسی) عورتوں سے نکاح کر لو جو تمہیں پسند ہوں۔ دو دو اور تین تین اور چار چار اور اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہیں کرسکو گے تو ایک ہی۔

لہٰذا قرآن کی رو سے

(۱) قانون بیک وقت ایک ہی بیوی (Monogamy) کا ہے۔

(۲) لیکن اگر کبھی معاشرہ میں ایسے حالات ہنگامی طور پر پیدا ہو جائیں کہ یتیم بچے اور بے شوہر کی عورتیں بہت زیادہ رہ جائیں، تو ایسی اجتماعی مشکل کے حل کی ایک صورت یہ ہے کہ ''ایک بیوی'' کے قانون میں عارضی استثناء کر دیا جائے۔

اس آیت میں الیتٰمیٰ سے عربی زبان کی رو سے وہ بچے بھی ہیں جن کے ماں باپ مر جائیں اور عربی لغت لسان العرب کی رو سے اس عورت کو بھی کہا جاتا ہے جس کا خاوند نہ ہو۔ لہٰذا ان میں سب وہ شامل ہیں جو خواہ وہ بیوہ ہوں اور خواہ وہ غیر شادی شدہ جوان لڑکیاں جنہیں خاوند نہ مل سکے۔ قرآن نے بھی اسی سورت کی آیت ۱۲۷ میں یَتَامیٰ النِّسَآءِ کی اصطلاح انہی معنوں میں استعمال کی ہے۔

قرآن ہی کی ممانعت کی وجہ سے ان (مسلمان) عورتوں کی شادی غیر مسلموں سے ہو ہی نہیں سکتی۔ انہیں مسلمان گھروں کے اندر ہی جذب ہونا ہے تو اس کی شکل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک خاندان میں، ایک سے زیادہ بیویوں

کی اجازت دے دی جائے۔ظاہر ہے کہ یہ اجازت اجتماعی ہے انفرادی نہیں۔یعنی معاشرہ ہی اس کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں یا نہیں۔

(۳) ایسی حالت پیدا ہوجانے کے بعد' ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت بھی صرف اسی فرد کو دی جاسکے گی جو ان سب سے عدل کرسکے اور ان خاندانوں کی پرورش کا کفیل ہوسکے۔عدل کی شرط کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ تو نفسیاتی طور پر ناممکن ہے کہ تم ہر بیوی کو یکساں چاہو۔

وَلَن تَسْتَطِيعُواْ أَن تَعْدِلُواْ بَيْنَ النِّسَاء وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلاَ تَمِيلُواْ كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِن تُصْلِحُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ غَفُوراً رَّحِيماً۔ (۴/۱۲۹)۔

اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں کو اگرچہ اس کی حرص کرو۔سو بالکل پھر بھی نہ جاؤ کہ ڈال رکھو ایک عورت کو جیسے ادھر میں لٹکتی۔

سورہ النساء کی اسی تیسری آیت میں جس میں تعدد ازدواج کا اصول سامنے لایا گیا ہے' اس کی وضاحت میں مولانا محمد علی نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں درج ذیل نکات اٹھائے ہیں۔

(۱) الیتامیٰ اصطلاح شریعت میں یتیم صرف اس کو کہا جاتا ہے جو حدِ بلوغ کو نہ پہنچا ہو اور لسانِ العرب میں ہے کہ یتیم اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کا خاوند نہ ہو۔

(۲) ماطاب لکم من النساء سے مراد امہات الیتامیٰ ہیں یعنی یتیم بچوں کی مائیں۔اور الا تقسطوا فی الیتامیٰ میں مراد یتیم بچے ہیں۔تو گویا آیت کا مطلب یوں ہوا کہ اگر تم کو خوف ہو کہ یتیم بچوں کے بارہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایسی عورتوں سے جن کے وہ بچے ہیں نکاح کرلو۔کیونکہ نکاح سے وہ بچے اولاد کی حیثیت حاصل کرلیں گے اور ان کی ذمہ داری شوہر پر ہوگی کیونکہ اصل مضمون اس رکوع میں عورتوں سے نکاح کا نہیں بلکہ یتامیٰ کی خبر گیری ہے۔پس یتامیٰ کی خبر گیری کی ایک دقت رفع کرنے کے لئے ایسے نکاح کو ایک علاج کے طور پر بتایا ہے۔

(۳) اسی ماطاب لکم کے ضمن میں یہ بھی معلوم ہوا کہ نکاح کے لئے پسندیدگی شرط ہے اور پسندیدگی کے لئے دیکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔اس سے ایک اور استنباط بھی ہوسکتا ہے یعنی جب مرد عورت کو دیکھ سکتا ہے تو عورت کے بھی ایسے مرد کو دیکھ لینے میں کوئی امر خلافِ شریعت نہیں۔مزید یہ کہ نکاح چھوٹی عمر میں نہیں ہونے چاہئیں اس لئے کہ ایک چھوٹی عمر کا بچہ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کس طرح کرسکتا ہے جب وہ اس کو سمجھنے کے ہی قابل نہیں۔

طلوع اسلام کا بھی اس ضمن میں یہی موقف رہا ہے کہ پسندیدگی کے عمل میں دونوں مرد و زن شامل ہوتے ہیں جب کہ اس کی سند میں قرآن نے مردوں کے لئے ممانعت کی ہے کہ وہ

يَا أَيُّـهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ يَحِـلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُواْ النِّسَاء كَرْهاً۔ (۴/۱۹)۔

اے ایمان والو حلال نہیں تم کو کہ میراث (ملکیت) میں لے لو عورتوں کو زبردستی۔

(۴) علاوہ تعددِ ازدواج کے لئے دوسری ضروریات کے جنگ ایک ایسی ہی ضرورت ہے کہ بعض حالات میں تعدد ازدواج پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جو عورتیں بلا خاوندوں کے ہوں گی وہ نسلِ انسانی کی ترقی میں صرف تعددِ ازدواج کے ذریعہ معاون ہو سکتی ہیں۔ اس سے علاوہ عموماً عورتوں کے معاش کا انحصار مردوں پر ہوتا ہے پس جو عورتیں جنگوں میں بیوہ رہ جاتی ہیں یا یتیم (بے شوہر) رہ جاتی ہیں ان کے متعلق پیچھے رہے ہوئے مردوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان کی خبر گیری اور پرورش کریں اور اس کے لئے ایک ہی راہ ہے' جو قدرت نے رکھی ہے یعنی ان کو نکاح میں لے آنا۔ اس لئے بعض حالات میں تعدد ازدواج ایک فرض قوی ہو جاتا ہے۔

(۵) یہ تو ظاہر ہے کہ دو تین چار بیبیوں سے نکاح کرنا کسی شرط سے مشروط ہے اور وہ شرط یتیموں کے بارہ میں انصاف نہ کر سکنے کا خوف ہے۔ پس اول تو یہ آیت صرف ان لوگوں کے لئے ہوئی جن کو یتامیٰ کی خبر گیری سے تعلق پڑتا ہے اور عام نہ ہوئی اور یہ خود اس کی حکم ہونے کے خلاف دلیل ہے کہ یہ مشروط اجازت ہے نہ کہ حکم۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(پانچواں باب)

سورۃ الفاتحۃ

(آیت 4: ایاک نعبد)

نگاہِ بازگشت

عزیزانِ من! اب ہم سورۃ الفاتحۃ کی چوتھی آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) پر آ گئے ہیں۔ پہلے درسوں میں آپ نے یہ دیکھا کہ اس عظیم سورۃ کے پہلے ہی کچھ الفاظ ہیں، جو عمدگی سے دین کے پورے نظام کو مربوط شکل میں سامنے لاتے چلے گئے ہیں۔ یعنی حمدیت اپنی مکمل شکل میں تماماً اور اکملاً صرف اللہ کے لیے ہے اور اللہ وہ ہے جو مکمل ترین اقتدار کا مالک ہے اور اس کی حمدیت اس لیے ہے کہ وہ رب العالمین ہے، یعنی پوری کی پوری کائنات، بلکہ کائناتوں کا ہی نہیں، انسانوں کا، تمام اقوامِ عالم کا، پوری نوعِ انسانی کا، ہر ذی حیات کا، وہ رب ہے۔ ان کو اس طرح نشوونما دیئے چلا جاتا ہے کہ وہ اپنے نقطۂ آغاز سے بتدریج، ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، نقطۂ تکمیل تک جا پہنچتی ہیں اور اس کی اس نشوونما دینے کا ایک پروگرام رحیمیّت ہے۔ یہ تو عام پروگرام ہے جو مسلسل، متواتر، التزاماً، تدریجاً ہوتا چلا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی عندالضرورت اس کی صفت رحمانیت کا بھی ظہور ہوتا ہے، جو اس کے اس پروگرام کا دوسرا حصہ ہے، جس کے معنی ہیں: ''ہنگامی طور پر کسی کے لیے سامانِ نشوونما مہیا کرنا''۔ لیکن سامانِ نشوونما تو وہی مہیا کر سکتا ہے، اس سامان پر جس کا پورا پورا کنٹرول ہو۔ اگر یہ سامان و وسائل و ذرائع کسی اور کے قبضے میں ہوں تو پھر تو یہ ہستی کسی کی نشوونما نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس کی اگلی بنیادی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3) وہ نظام کہ جس کے اندر یہ نشوونما اس انداز سے سرانجام پاتی چلی جائے گی، اس میں کنٹرول اور اقتدار صرف خدا کا ہوگا تو گویا اتنے حصے تک سورۃ الفاتحۃ میں کہا یہ گیا ہے کہ یہ ہے وہ خدا، یہ ہے وہ اللہ، یہ ہے اس کا نظام، یہ ہے اس کا ایک پروگرام جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔

اب اس کے بعد فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تم اس کو سمجھ گئے ہو اور اب اس پہ تمہارا یقین اور ایمان ہے کہ درحقیقت یہی نظام ہے، جو نوعِ انسانی کے لیے اس کی منزل تک پہنچانے کا ذمے دار ہو سکتا ہے اور ہر فرد کے لیے بھی کہ وہ اپنے دل میں یہ کہے کہ یہی ہے وہ نظام جس میں میری انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوگی اور اس درجے تک ہوتی چلی جائے گی کہ میں اس زندگی کے بعد بھی اگلی

زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ جب انسان دل و دماغ کی پوری رضامندی سے اس کی صداقت کا قائل ہو جاتا ہے تو یوں کہیے کہ اس کے بعد پھر پوچھا یہ جاتا ہے کہ اب تم بتاؤ اور نہایت اطمینان سے بتاؤ' دل و دماغ کی رضامندی سے بتاؤ' جذباتی طور پر نہیں' علیٰ وجہ البصیرت بتاؤ کہ پھر تم کس کی محکومیت اختیار کرو گے۔ جس نے ان حقائق پر اس طرح سے غور کیا ہے' اس طرح اسے دل و دماغ کی رضامندی سے قبول کیا ہے' اس کی صداقت کا قائل ہو گیا ہے' تو اس کی زبان سے اس کے جواب میں اس کے سوا کوئی دوسرا لفظ آ ہی نہیں سکتا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4)

سورۃ الحمد کے الفاظ ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' کی تفسیر

ایاک کے معنی ہیں: تیری اور صرف تیری۔ اس آیت (1:4) میں کہا کہ ہم تیری اور صرف تیری محکومیت اختیار کریں گے۔ کوئی اور اس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اب آپ دیکھ لیجیے' عزیزانِ من! کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کس مقام پر آیا ہے؟ اس کا مفہوم کیا ہے؟ اور ایک عبد مومن کیا اقرار کرتا ہے؟ ایک عبد مومن' ایک عبد مسلم' جس نے ان حقائق کو سمجھ لیا ہے' وہ پھر اپنے لیے کس قسم کی زندگی بسر کرنے کا آغاز کرتا ہے' اقرار کرتا ہے' عہد کرتا ہے' پروگرام بناتا ہے؟ وہ زندگی ہے ایاک نعبد کی کہ ''تیری اور صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں''۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ کتنا عظیم پروگرام ہے لیکن یہ تو دین کا پروگرام تھا۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہوا ہے تو جیسا میں نے پچھلے ہی درس میں کہا تھا کہ یہ ''نعبد'' تھا۔ اس کا ترجمہ ہوا: پرستش کرنا۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں تو گویا خدا ایک پرستش کی شے ہو گیا اور ہم صرف اس کی پرستش کرنے والے۔ پرستش کرنے سے آپ غور فرمائیے کہ کیا تاثرات آپ کے ذہن میں Imprint (مرتسم) ہوتے ہیں۔ آگے چل کر یہ مسئلہ بتاؤں گا کہ صرف یہی جو اتنی بات ہے کہ خدا نے انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ یہ اُس کی پرستش کریں خدا کے متعلق کیا تصور پیدا کرتا ہے لیکن یہاں جو کہا گیا ہے کہ ''ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں'' تو یہ محکومیت اختیار کرنے کے بھی معنی یہ ہوں گے کہ ہم صرف اسی نظام کے تابع زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جس نظام کا ذکر ان پہلی تین آیتوں میں ہوا ہے۔ ہم کچھ اور چاہتے ہی نہیں۔ یہی الاسلام ہے اور اسی کے مطابق' ہم اپنا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی کے تابع ہم رہنا چاہتے ہیں' اسی کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں' اسی کی محکومیت اختیار کرنا چاہتے ہیں اور یہی ہے نعبد کا ترجمہ' خود عربی زبان کے اعتبار سے اور قرآن کریم کے اعتبار سے بھی۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں پرستش کی بجائے عبادت کا تصور پیش کیا ہے

لفظ عبادت کا مادہ ''ع ب د'' ہے۔ Worship (پرستش) کا تو تصور ہی قرآن میں نہیں ہے۔ اب یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ وہی مادہ ہے جس سے لفظ ''عبد'' آتا ہے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ ''عبد'' کے معنی غلام اور محکوم کے ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ

لفظ ٹھیک غلامی، محکومی اور اطاعت گزاری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دو ایک مقامات بطور سند میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، جس سے نظر آ جائے گا کہ یہ ''ع ب د'' کا جو مادہ ہے اور اس سے جو لفظ ''عبادت'' بنا ہے یا ''نعبد'' بنا ہے یا ''یعبد'' آیا ہے، یہ تمام الفاظ اس مادہ سے بنے ہیں۔ اس کے معنی محکومیت اختیار کرنے کے ہیں، اطاعت اختیار کرنے کے ہیں۔ اس کے معنی Worship (پرستش) کے معنی نہیں ہیں۔ مثلاً سورۃ الشوریٰ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ وہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دے، تو اس نے ان سے کہا کہ موسیٰ! ہم نے تم پر اس قدر احسانات کیے اور تم ہمیں ان احسانات کا بدلہ یوں دے رہے ہو کہ پوری قوم کو ہمارے خلاف مشتعل کر رہے ہو اور اس درجہ مشتعل کہ تم ان کو یہاں رہنے بھی نہیں دینا چاہتے، چاہتے یہ ہو کہ تم ان کو یہاں سے لے کر چلے جاؤ۔ تم یہ بدلہ دے رہے ہو، میرے احسانات کا جو میں نے تم پر کیے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ ہاں، تمہارے احسانات یہی ہیں کہ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ❶ (26:22)۔ یہ دیکھیے کہ یہ لفظ ''عبدت'' وہی ''ع ب د'' سے ہے۔ کہا کہ تمہارے احسانات یہی ہیں کہ تم نے میری قوم کو اپنی غلامی اور محکومی کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ یہاں سے ''عبدت'' کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے فرعون اور اس کے اکابرین کو خدا پر ایمان لانے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا (23:47) کیا ہم ان کی بات مان لیں جو ہمارے ہی جیسے دو آدمی ہیں۔ یعنی بشر ہونے کے اعتبار سے تو وہ ہمارے ہی جیسے ہیں، فوق البشر نہیں ہیں اور اسی آیت میں اگلی بات یہ کہی کہ وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ❷ (23:47) اس آیت میں ''عابدون'' کا لفظ آیا ہے، یعنی وہی عبادت کرنے والے جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ کہا کہ ''اور اس کی قوم ہماری محکوم قوم ہے''، یعنی یہ فوق البشر نہیں ہے اور یہ بھی نہیں ہے کہ بشر ہونے کی حیثیت سے یہ حاکم قوم کے افراد ہوں۔ اب سوچیے کہ محکوم قوم کے جو افراد ہیں، کیا ہم ان پر ایمان لے آئیں، ان کی بات تسلیم کر لیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان مقامات اور انہی جیسے دیگر مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عبدیت کے معنی ''خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہے''۔ اس کے قوانین کی اطاعت اختیار کرنا ہے، اس کے معنی پرستش کرنا نہیں ہے۔ سورۃ الکھف میں محکومیت اور عبادت کے الفاظ مرادف معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ذرا غور کیجیے۔ ایک جگہ کہا کہ وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) خدا اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں فِیْ حُكْمِهٖ (18:26)

---

❶ تم پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو اپنی محکومی کے شکنجے میں جکڑے رکھو!

❷ اور جہاں تک رتبہ اور مرتبہ کا تعلق ہے وہ اس قوم کے افراد ہیں جو ہماری محکوم ہے۔

آیا ہے۔اب لفظ ''حکم'' تو آپ کے سامنے ہے۔حقِ حکومت یہی چیز ہے۔خدا اپنی حاکمیت میں' اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا اور دوسری جگہ ہے کہ جو لوگ اپنے مستقبل کو خوشگوار اور حسین بنانا چاہتے ہیں' ان کے لیے ضروری ہے کہ وَلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (18:110) تم خدا کی عبادت میں کسی کو مت شریک کرو۔ایسا شخص جو اپنے مستقبل کو خوشگوار بنانا چاہتا ہے' اسے چاہیے کہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔اب یہ دیکھیے کہ پہلے یہ کہا تھا کہ خدا لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِهٖ اَحَدًا ❶ (18:26). اور دوسری جگہ ان الفاظ میں کہا کہ وَلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ❷ (18:110) جو وہاں حُکْمِهٖ (18:26) آیا ہے' دوسری جگہ اس کے لیے لفظ عِبَادَةِ (18:110) آیا ہے' تو عبادت کے معنی ہی حکم ہیں' احکام ہیں' حکومت ہے۔

تصرفِ آیات کے تحت لفظ عبادت کا مفہوم

سورۂ یوسف میں حضرت یوسفؑ نے اپنے قید خانے کے ساتھیوں سے کہا کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) یاد رکھو! حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔آپ غور کیجیے کہ ایک نبی کا فریضہ کیا ہے؟ فرعون جیسے بادشاہ کی مملکت میں قید میں پڑے ہوئے ہیں' دو اور قیدی وہاں ساتھ ہی قید ہیں' ان سے کہا جا رہا ہے' یہ تلقین کی جا رہی ہے' تعلیم دی جا رہی ہے' یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ یاد رکھو! حقِ حکومت اس بادشاہ کو حاصل نہیں ہے' حقِ حکومت تو صرف خدا کو حاصل ہے۔نبی تو خدا کے سوا کسی اور کے اقتدار کو بغاوت تصور کرتا ہے یعنی انسان پر انسان کی ہر قسم کی حکومت سے بغاوت کرنے والا اور صرف ایک خدا کی محکومیت کو تسلیم کرنے والا۔بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ انہوں نے ان سے کہا کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) اب حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے اور اس کے آگے ہے کہ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ (12:40) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔اب یہ دیکھیے کہ وہاں کہا ہے کہ ''الحکم'' اللہ کے لیے ہے اور یہاں کہا ہے کہ اس کا ''حکم'' یہ ہے کہ میرے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو اور لفظ ''عبادت'' ہی آیا ہے اور اس کے بعد کہا کہ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (12:40) یہ ہے دین محکم۔اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ قرآنِ کریم کی رُو سے خدا کی ''عبادت'' سے مراد ہے: ''اُس کی محکومیت اختیار کرنا' اس کے قوانین کی اطاعت اختیار کرنا'' اور اسی کا نام الدین ہے۔اس کی وضاحت سابقہ درس میں ہو چکی تھی۔ دین کے معنی بھی سامنے آ گئے تھے اور یہ بھی کہ اطاعت صرف اس نظام اور اس دین کی ہے جس میں خدا کے قوانین جاری و ساری ہیں۔

---

❶ خدا اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

❷ اپنے رب کی محکومیت میں کسی کو شریک نہ کر۔

قرآنی قوانین کی اطاعت دوسرے معنوں میں اللہ تعالیٰ کی محکومیت کا نام ہے

اب جیسا کہ میں نے وہاں یہ کہا تھا' میں اسے پھر دہرادوں کہ جب خدا نے یہ کہا تھا کہ ہماری یہ محکومیت یا خدا کی حاکمیت' ایک ڈکٹیٹر کی حاکمیت نہیں ہے بلکہ ہم نے اس کے لیے ایک ضابطہ قوانین بھیجا ہے۔ اس ضابطۂ قوانین کی اطاعت کا نام ہماری محکومیت اختیار کرنا ہے تو گویا خدا کی یہ گورنمنٹ آج کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ وہ گورنمنٹ' آئینی گورنمنٹ ہے' وہ Rule of the Law ہے' وہ قانون کی حکومت ہے اور پھر قانون بھی ایسا عمدہ! عزیزانِ من! غور کیجیے۔ انسانوں کی دنیا میں تو ابھی' اگر اتنا ہی کہہ دیا جائے کہ وہاں قانون کی حکومت ہے' تو اسی سے ہی لوگ اس نظام کو دنیا کے لیے باعثِ رحمت قرار دیتے ہیں۔ سب سے بہترین نظام اسی کو قرار دیتے ہیں جس میں قانون کی حکومت ہو لیکن دنیا میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی کیفیت تو یہ ہے کہ آج ایک قانون بنتا ہے' کل ہی اس کی جگہ دوسرا قانون بن جاتا ہے۔ ڈکٹیٹر کو چھوڑ دیجیے' ملوکیت کو چھوڑ دیجیے کہ وہاں تو ہر آن اس کی مرضی کے مطابق کام ہوتا ہے' بلکہ یوں کہیے کہ وہاں قانون تو ہوتا ہی نہیں' احکام بدلتے رہتے ہیں۔ جسے آپ ڈیموکریسی (جمہوریت) کہتے ہیں' جس میں آپ حقِ حکومت خود انسانوں کو دیتے ہیں' ان کی بھی یہ کیفیت ہے کہ اول تو وہی پارلیمنٹ کے ممبرز' جو آج اکثریت میں ہیں' وہی اپنے بنائے ہوئے قانون میں کل ہی تبدیلی کر دیتے ہیں اور اس سے آگے بڑھیے تو آج جو اکثریت ہے' وہ اگر دو ممبروں کے پیچھے ہٹ جانے سے اقلیت (Minority) کے اندر آ جاتے ہیں تو ان کے جو مخالف پارٹی آتی ہے' وہ Majority (اکثریت) میں آ کر نئے قوانین بناتی ہے جو پہلے سے بنائے ہوئے قوانین کے بالکل خلاف جاتے ہیں۔ یہاں تو قانون ہی راہیں بدلتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کے قوانین کی کیفیت یہ ہے کہ وہ انسانوں کا بنایا ہوا قانون نہیں ہوگا بلکہ جو انسان سے بلند و بالا تر ہستی ہے اس کا بنایا ہوا قانون ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:24) اس میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔

انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ضابطہ حیات غیر متبدل ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں قوانین دے دیئے۔ یہ کہہ دیا کہ یہ مکمل ہو گئے: تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا [1] (6:116)۔

یہ مکمل ضابطہ حیات ہے' اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) کوئی ان میں تبدیلی نہیں کر سکتا' تو یہ ضابطۂ حیات مکمل اور غیر متبدل ہے اور پھر یہ کہ یہ محفوظ ہے۔ اس کے بعد کہا کہ اب تم اس ضابطہ قوانین کو دیکھ لو' سمجھ لو' پرکھ

---

[1] اس قرآن میں' خدا کا ضابطہ قوانین' تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے' اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے' مکمل ہو چکا ہے۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)

لو۔ اگر تمہارا دل اس پر پختہ ہے کہ یہ واقعی اس قابل ہے تو اس کے تحت زندگی بسر کرو۔ اگر انسان کو شرف اور خوشگواریوں کی زندگی بسر کرنا ہے تو اسے تسلیم کرو' اس کے مطابق نظام قائم کرلو۔ کتنا امن اور اطمینان نصیب ہو جاتا ہے اس قوم کو جو اس طرح کسی ضابطہ قوانین کو صحیح تسلیم کرے اور اس کے بعد اسے یہ یقین ہو کہ یہ کبھی تبدیل ہی نہیں ہوگا۔ یہی نہیں کہ آج کی حکومت اسے تبدیل نہیں کرے گی' کوئی آنے والی حکومت بھی اسے تبدیلی نہیں کرسکتی' کوئی انسان اسے تبدیل نہیں کرسکتا۔

اللہ تعالیٰ بھی اپنے بنائے ہوئے قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا

اب یہاں ایک بڑا عظیم نکتہ ہے' عزیزانِ من! یہ کچھ ماننے کے بعد شاید کوئی یہ کہہ دیتا کہ ٹھیک ہے' کوئی انسان تو اس میں تبدیلی پیدا نہیں کرے گا یا کرسکتا' اگر کل کو خدا کی طرف سے اور نبی آ گیا تو وہ تو اس میں تبدیلی پیدا کر دے گا۔ یعنی اس کے ذریعے سے تو خدا ایسے قوانین دے دے گا' جو ان قوانین کے برعکس ہوں یا ان میں ترمیم و تنسیخ کرسکیں' ایسا تو ہو سکے گا تو پھر یہ ناقابلِ تغیر کس طرح ہو گئے؟ پھر ہم اس کا اطمینان کس طرح کرلیں کہ جن قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے کا ہم نے آج عہد کیا ہے' یہ قوانین غیر متبدل ہیں؟ عزیزانِ گرامی قدر! اس کے لیے اللہ نے یقین دلا دیا کہ مطمئن رہو' ہم نے ختم نبوت کا اعلان کر دیا ہے' ہماری طرف سے اس کے بعد کوئی نبی بھی نہیں آئے گا جو آ کر یہ کہے کہ خدا نے ان قوانین میں یوں تبدیلی کر دی ہے۔ آپ غور کیجیے گا کہ کس قسم کا نظام ہے' جو خدا آگے دیتا ہے کہ اور تو اور کوئی شخص اب آ کے یہ بھی نہیں کہے گا کہ خدا نے ان میں یہ تبدیلی کر دی ہے اور میں وہ تبدیلیاں لے کر آیا ہوں۔ نبوت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ قیامت تک کے لیے ایک عالم گیر نظام دے دیا۔

آدمی کے لیے یہ ایک سجدہ ہزار سجدوں سے نجات کا باعث بنتا ہے

اس کے معنی ہو گئے خدا کی عبادت' خدا کی عبدیت' خدا کی عبودیت' اس کی محکومیت' اس کی اطاعت۔ یہ ہے جب ایک عبد مومن خدا کے سامنے کہتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) تو آپ سوچیے' اسے ایک طرف کس قدر اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف اتنا عظیم انقلاب ہے جس کا وہ اعلان کرتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4). کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کریں گے' صرف تیری کریں گے' اس عبدیت میں ایک اور نکتہ بھی مضمر ہے۔ عربی زبان میں تَعْبِیْدٌ [1] کے معنی ہوتے ہیں ''اونٹ یا گھوڑے کو سدھا کر جوتنے کے قابل بنا دینا [1]''، یعنی اس وحشی جانور کو اس طرح سدھانا کہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو خاص قاعدے اور ضابطے کے مطابق صرف

---

[1] اسے انگریزی میں Breaking یا Harnessing کہتے ہیں۔ لین Lane نے Broken, or Trained کہا ہے۔
(Ref. Lane, Edward William (1968). An Arabic- English Lexicon Part 15. Lebanon: Librairie Du Liban, p. 1936)

کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتیں اور قوتیں عطا کیں ہیں۔ اگر انسان ان قوتوں کو نوع انسانی کے مفاد کی بجائے اپنے جذبات کو سرکش اور بے باک رکھتا ہے یعنی اپنے جذبات کو ذاتی طور پر اپنے جذبات کے مطابق یا اجتماعی طور پر اپنی قوم کے مفاد کی خاطر اپنی مرضی کے مطابق صرف کرتا ہے تو نتیجہ فساد اور تخریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا لیکن اگر انہی صلاحیتوں کو حدود اللہ کے اندر رکھتے ہوئے' اس کے مقرر کردہ قوانین وضوابط کے مطابق' صرف میں لاتا ہے تو اس کا نتیجہ عالم گیر ربوبیت اور اس کی اپنی ذات کی تعمیر ہوتا ہے۔

ساحلوں کے اندر بہنے والے پانی اور سیلاب کے پانی میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے

اس نہج سے دیکھیے تو عبادت کے معنی ہوں گے: اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اس میں سیلاب کی مثال بات کو اور واضح کر دیتی ہے۔ دریا میں بے انتہا پانی ہوتا ہے' وہی دریا اگر ساحلوں کے اندر بہتا ہے تو وہ تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے لیکن اگر وہ ساحل فراموش ہو جائے' اگر وہ ساحلوں کو توڑ دے' بے باک ہو جائے تو وہی پانی دریا کی بجائے سیلاب کہلاتا ہے اور وہ تباہیاں لاتا چلا جاتا ہے۔ اس پانی نے خدا کی عبودیت اختیار نہیں کی۔ یہ سرکش ہو گیا۔ میں ذرا آگے چل کر بتاؤں گا کہ قرآن نے اسی کو شیطنت کہا ہے کہ وہ خدا کا محکوم نہ رہا' شیطان کا محکوم ہو گیا۔ یعنی اس نے سرکش قوتوں جیسی روش اختیار کر لی۔ اپنے جذبات کے تابع یہ کچھ کیا' تو پھر بھی وہ خود شیطان تھا' اس کی شیطنت نے یہ تخریب پیدا کی۔ اگر اجتماعی طور پر یہ کچھ کیا ہے تو وہ نظام ایسا تھا کہ جس میں خدا کے قوانین سے سرکشی اختیار کی تو اس کا نتیجہ سیلاب ہو گیا' تو عبادت کا یا عبدیت کا جو مفہوم ہے' جو مقصود ہے' وہ تعمیر ہے یعنی کسی کی صلاحیتوں کو اس طرح سے سدھانا' اس طرح ان کی تربیت کرنا کہ وہ قاعدے اور قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرگرم عمل ہوں۔ عبادت کے معنی یہ ہو گئے تھے۔

اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف کی شکل میں ظاہر ہوگا

سورۃ النور کی وہی آیت (24:55) آپ ایک دفعہ پھر سامنے لائیے جو اس سے پہلے بھی شاید ایک یا دو بار آپ کے سامنے آ چکی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (24:55) خدا کا یہ وعدہ ہے' اس کا اٹل قانون ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں مملکت' حکومت اور خلافت ہے۔ تاریخ اس کی شہادت پیش کرے گی کہ جن قوموں نے یہ روش اختیار کی' انہیں اس دنیا کے اندر استخلاف حاصل ہو گیا لیکن یہ استخلاف مقصود بالذات نہیں تھا۔ یہ کاہے کے لیے تھا؟ اس کے جواب میں کہا کہ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ

(24:55) یہ اس لیے تھا کہ وہ اس نظام کو قائم کر سکیں' Establish (ثبت) کر سکیں' محکم کر سکیں' جسے ان کے لیے تجویز کیا گیا ہے' پسند کیا گیا ہے تو گویا یہ جو مملکت ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں ملتی ہے' وہ دین کے تمکن کے لیے ملتی ہے۔

دین کے تمکن کا فطرتی نتیجہ اطمینان قلب اور آسودگی ہے

اب دین کے تمکن میں ہوتا کیا ہے؟ اس میں پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (24:55) انسان کو کامل امن نصیب ہو جاتا ہے' کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں رہتا ہے۔ ابھی ابھی میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اگر انسان کے سامنے ایسا ضابطہ قوانین ہو' جسے وہ علم و بصیرت کی رو سے' قلب و دماغ کے پورے اطمینان سے' اپنے لیے مفید سمجھے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کرے تو یہاں ہی اسے امن نصیب ہو جاتا ہے اور اگر اس کے بعد یہ یقین ہو کہ یہ ضابطہ قوانین جسے میں نے اختیار کیا ہے' اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی تو یہ امن دوام حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیشگی آ جاتی ہے جو خالدین فیھا ابدا - (24:55) ہے۔ وہ اس امن کی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہتا ہے کہ اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ جو اس مملکت کے اندر اسے اس طرح کا امن نصیب ہوا' تو اس سے وہ اس قابل ہوا کہ يَعْبُدُوْنَنِىْ (24:55) وہ صرف میری محکومیت اختیار کر سکے۔

میں نے جیسا کہا تھا کہ خدا کی عبادت تو صرف اپنی آزاد مملکت کے اندر کی جا سکتی ہے جس کا مقصد دین کا تمکن ہو۔ یہاں کہا ہے کہ يَعْبُدُوْنَنِىْ (24:55) صرف میری عبادت کر سکے' میری محکومیت اختیار کرے لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْـًٔا (24:55). اور اس میں کسی اور چیز کو شریک نہ کرے۔ یہ ہے شرک کے معنی۔

سب سے بڑا شرک یہ ہے کہ حکومت کسی کی ہو اور محکومیت کسی کی

عزیزان من! میں نے جیسا کہا تھا کہ جب خدا کی عبادت کا ترجمہ پرستش Worship کر دیا جائے' تو پھر شرک کے معنی بت پرستی ہو جائے گی یعنی حکومت کسی کی ہو' محکومیت کسی کی اختیار کی جائے۔ اگر ہم نے خدا کی پرستش کر لی یا پھر ہم نماز پڑھ کے کہتے ہیں' ہم خدا کی پرستش کر رہے ہیں' اگر ہم نے خدا کی پرستش کر لی تو سمجھ لیجیے کہ اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ وہ جو رحیم کا منشا تھا' وہ پورا ہو گیا کیونکہ اس نے یہی کہا تھا کہ تم اس قابل ہو جاؤ کہ میری پرستش کرو' تمہیں کوئی مجبور نہ کرے کہ تم بتوں کی پرستش کرو۔ پرستش تو ہر حکومت کے تابع ہو سکتی ہے' عبادت تو ہر حکومت کے تابع نہیں ہو سکتی۔ وہ تو صرف اس استخلاف فی الارض میں ہوتی ہے جو دین کے تمکن کے لیے عمل میں آتا ہے اور یہاں بھی آ گیا کہ يَعْبُدُوْنَنِىْ (24:55) میری ہی عبادت تم کرو' اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرو۔ یہ وہ چیز تھی جس کا عبد مومن نے اعتراف اور اعلان کیا تھا کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (1:4) ہم صرف تیری عبودیت اختیار کریں گے۔

نزول قرآن سے قبل ہر جگہ ہر سطح پر عبادت کا مفہوم پرستش ہی تھا

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک چھوٹا سا نکتہ ہے جس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ قرآنِ کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں دین کہیں باقی نہیں رہا تھا' ہر جگہ مذہب ہی مذہب تھا۔ مذہب میں خدا کی محکومیت نہیں بلکہ اس کی پرستش کا تصور ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے عربی بولنے والے اہلِ مذاہب اور مشرکین عرب عبادت کے اس لفظ کا مفہوم پرستش لیتے تھے کیونکہ ان کے ہاں محکومیت کا تو تصور ہی نہیں تھا۔ خدا کی حاکمیت کا تصور بھی نہیں تھا۔ اس لیے ان کے ہاں اہل مذاہب میں جو یہودی اور عیسائی تھے بلکہ ایران کے جو مجوسی بھی تھے' ان تینوں کے ہاں خدا کی پرستش کا تصور تھا اور ان قریش میں بھی ان کی دیکھا دیکھی' اس لفظ کا مفہوم یا تصور یا معنی' پرستش رہ گیا تھا۔ وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ لہٰذا جب ہم قرآنِ کریم میں اس لفظ کو ان لوگوں کی طرف نسبت کرتے ہوئے دیکھیں گے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم فلاں کی عبادت کرتے ہیں تو وہاں اس کے معنی ان کے تصور کے مطابق پرستش ہوگا لیکن جب اس کی نسبت اللہ کی طرف ہوگی' جماعت مومنین کی طرف ہوگی' امت مسلمہ کی طرف ہوگی' مسلمانوں کی طرف ہوگی' تو پھر اس کے معنی پرستش نہیں ہوں گے' اس کے معنی خدا کی محکومیت ہوں گے: پرستش اہل مذاہب کے ہاں اور محکومیت خدا کے نظام کے تابع زندگی بسر کرنے والی امت مسلمہ کے ہاں۔ اس کو زیرِنظر رکھیے کیونکہ کہیں کہیں قرآن میں جب ہم دیکھیں گے کہ یہ لفظ ان لوگوں کی زبان سے آیا ہے تو وہاں انہی کا جو تصور تھا' وہی اس کا مفہوم لیا جائے گا۔ یعنی وہاں اس کا مفہوم پرستش ہوگا' اپنے ہاں نہیں۔

دین اور مذہب میں بنیادی فرق عبادت اور پرستش کے مفہوم میں ہے

ان حقائق کی روشنی میں' عزیزانِ من! ہم اس مقام پہ آ گئے ہیں کہ جہاں دین اور مذہب کی غایت' مقصد اور منتہیٰ کا فرق نکھر کر سامنے آ جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے پہلے بھی یہ آیت پیش کی تھی اور اب تو اس مقام پر یہ نکھر کر واضح طور سے سامنے آ جائے گی کہ دین اور مذہب میں فرق کیا ہوتا ہے؟ وہ آیت ہے **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ** (51:56)۔ مذہب کی دنیا میں ہمارے ہاں آپ جہاں بھی' جس قرآن میں بھی دیکھیں گے' اُس کا ترجمہ یہ دیا ہوگا کہ ''ہم نے جن اور انس کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ ہماری پرستش کرتے رہیں''۔ جن اور انس کے معنوں میں آپ ابھی گہرے مفہوم میں نہ جایئے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ''وہ شہری زندگی کے لوگ' متمدن زندگی کے لوگ' تمدن کے اعتبار سے زندگی بسر کرنے والے لوگ ہوں' یا صحرائی لوگ' بدوی لوگ ہوں'' بہرحال انسان جس میں بھی ہیں' مذہب کی رو سے کہا یہ گیا کہ ان کو پیدا اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی پرستش کرتے رہیں یعنی خدا نے تو یہ کہا ہے کہ ہم نے تو انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ ہماری پوجا کرتے چلے جائیں یعنی یہ ہے منشائے تخلیقِ انسانی: ''خدا

کی پرستش کرتے چلے جائیں''۔ معاذ اللہ خدا کا کوئی ایک کام تھا اور اس کام کو پورا کرنے کے لیے اس نے انسانوں کو پیدا کر دیا۔ اب انسان یہاں جو کچھ کر رہا ہے یہ خدا کا کوئی مقصد ہے' جسے وہ پورا کر رہا ہے۔ اس کا کوئی اپنا مقصد نہیں ہے' اپنا مقصد اتنا ہی ہے کہ اگر یہ نہ کیا گیا تو خدا ناراض ہو جائے گا اور اس کی ناراضگی سے تو پھر جو سزا ملتی ہے' اس کے تو تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' کانپتا ہے' ڈرتا ہے کہ وہ مجھے سزا نہ ملے یعنی اس کے حکم کے نہ ماننے سے خدا راضی ہو جاتا ہے' خوش ہو جاتا ہے۔ گویا یہ ساری پرستش' یہ پوجا پاٹ' اس کے احکام کے مطابق کرنا' صرف اس لیے ہے کہ وہ خوش ہو جائے' راضی ہو جائے اور اگر یہ نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہو جائے گا' ناخوش ہو جائے گا اور سخت سزا دے گا۔

اللہ تعالیٰ کی محکومیت کی بجائے پرستش کے تصور نے ہماری نفسیات تک کو تبدیل کر دیا ہے

مذہب کی دنیا کے اندر اس کا خدا کے متعلق یہ تصور ذہن میں آتا ہے یعنی یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ کرو اور وہ نہ کرو' ایسے چلو اور ایسے نہ چلو' تو یہ سارا کچھ خدا کا کوئی اپنا پروگرام ہے اس کے مطابق وہ یہ چیز ہم سے کہہ رہا ہے۔ ہمارا اس کے اندر کچھ اپنا حصہ نہیں ہے کوئی اپنی غرض نہیں ہے' کوئی اپنی غایت نہیں ہے۔ اپنی غایت و غرض یہی ہے کہ ہم یہ کچھ کریں گے تو وہ ہمیں اس کا کوئی صلہ دے دے گا' کوئی بدلہ دے دے گا' کوئی معاوضہ دے دے گا' اگر نہیں کرے گا تو وہ پیٹے گا' کھال ادھیڑ دے گا۔ جیسے ہم اپنے ہاں مزدور لگاتے ہیں' معمار لگاتے ہیں۔ اپنے ہاں ہم نے اپنے نقشے کے مطابق کوئی مکان بنوانا ہوتا ہے اور اس نقشے کی تعمیر کے لیے یا اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ان مزدوروں کو' معماروں کو' Engage کرتے ہیں۔ ان سے یہی معاملہ ہوتا ہے کہ انہیں اس کا یہ صلہ یا معاوضہ ملے گا۔ اس مکان کی تعمیر میں' ان کی غرض و غایت' ان کا جو مقصد ہے' وہ صرف وہ معاوضہ لینا ہے اجرت لینا ہے جس کے لیے ان کو مقرر کیا گیا ہے۔ ان کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ کس نقشے کے مطابق مکان بن رہا ہے' ایسا کیوں بن رہا ہے' اس میں کون رہے گا' انہیں اس سے کوئی مقصد ہی نہیں ہے' ان کا اس میں کوئی Interest (دل چسپی) ہی نہیں ہے۔ انہیں کہا گیا کہ یہاں بنیاد کھود دیجیے' انہوں نے کھود دی۔ ان سے کہا گیا کہ اتنی اونچی دیوار بنا دیجیے' انہوں نے دیوار بنا دی۔ کہا گیا کہ اس قسم کی چھت ڈال دیجیے' اس کی چھت ڈال دی۔ اگر یہ ڈال دی ہے تو مالک راضی ہو گیا۔ اگر ایسا نہیں کیا تو وہ یقیناً ناراض ہو جائے گا' فوراً کام سے الگ کر دے گا' اجرت بھی نہیں دے گا۔ تو ہمارا اس میں Interest (دلچسپی) اس مکان کے بنانے میں ہے اور ان مزدوروں کا' ان معماروں کا' ان تمام کا' Interest (دلچسپی) صرف وہ اجرت ہے جو انہیں ملے گی۔ مکان کے اندر ان کا کوئی اپنا Interest (دلچسپی) نہیں ہے' اپنی کوئی غایت نہیں ہے' اپنا کوئی مقصد نہیں ہے۔

مذہب میں پرستش اور پوجا پاٹ کا جو تصور ہے یا جو کچھ بھی انسان کرتا ہے' اس کے لیے کہتا یہ ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ اس سے خدا

خوش ہوجائے' انسان کی اپنی کوئی غایت یا اپنا کوئی مقصد نہیں ہے۔ یعنی ان کا اس سے کچھ نہیں سنورتا' اُس کا کچھ سنورتا ہے۔ معاذ اللہ اس کا کوئی پروگرام تھا جس کے لیے اس نے یہ کہا کہ یہ کرو اور یہ کرو۔ یہ ہے اس کا تصور' عزیزانِ من! دین کے اندر تو تصور ہی کچھ اور ہے اور وہ تصور یہ ہے کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے کہ ایسا کرو' اس نہج کی زندگی بسر کرو' اس قسم کا نظام قائم کرو' تو اس سے خدا کا کچھ سنورتا نہیں۔ معاذ اللہ اس کا کوئی کام رکا ہوا نہیں ہے کہ اس نے اس کے لیے تم سے کہا ہے کہ یہ کچھ کرو تا کہ ہمارا یہ کام ہو جائے بلکہ یہ تمہارے ہی بھلے کے لیے ہم کہہ رہے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر جو مریض کو ہدایت دیتا ہے تو وہ اس مریض کے بھلے کے لیے ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کے مطابق عمل کرتا ہے تو اس سے مریض کی صحت ٹھیک ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ ڈاکٹر کی صحت ٹھیک ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس سے ڈاکٹر کی صحت پہ تو کوئی برا اثر نہیں پڑتا' مریض کی صحت پہ اثر پڑتا ہے' یہ Directives (ہدایات) ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ہدایت یا Directives دی ہیں کہ ایسا کرو اور ویسا کرو اور کہا ہے کہ اس کے مطابق زندگی بسر کرو تو اس کا مقصد یہ ہے۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہاری صحت درست ہو جائے گی۔ یہ جو میں نے ابھی مثال دی ہے ڈاکٹر اور مریض کی' اس اعتبار سے میں کہہ رہا ہوں۔ قرآنِ کریم نے عزیزان من! ہر مقام پہ یہ کہا ہے کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے کہ ایسا کرو' ایسا کہنے میں ہمارا کوئی مقصد نہیں پورا ہو رہا' ہماری اپنی کوئی غایت نہیں ہے۔ یہ تمہارے بھلے کی ہی کہہ رہے ہیں۔

''شکر'' کا قرآنی مفہوم انسانی صلاحیتوں کو قوانین خداوندی کے تابع صرف کرنے کے ہیں

سورۃ لقمان میں پہلی ہی چیز لکھی ہے کہ اس نے' یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا جو اس کی زبان سے ادا کیا جا رہا ہے' کہا کہ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ (31:12)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے: ''اللہ کا شکر کرو''۔ میں یہاں ''شکر'' کے یہ معنی بھی نہیں بتانا چاہتا۔ یہ بھی ایک بڑی اہم چیز ہے۔ اس کے معنی یوں سمجھ لیجیے کہ ''خدا کے بتائے ہوئے قوانین اور قواعد کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو صرف کرو تا کہ وہ بھرپور نتائج پیدا کریں''۔ یہ معنی ہوتے ہیں شکر کے۔ تو کہا یہ کہ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ (31:12) ترجمہ کیا گیا کہ اللہ کا شکر کرو حالانکہ ''اللہ'' کا شکر نہیں۔ یہاں للہ ہے۔ اس کے معنی ''کے لیے'' ہیں۔ اب اگر یہ ترجمہ کریں: ''اللہ کے لیے شکر کرو'' تو بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس غایت کے لیے' اس مقصد کے لیے' جو خدا نے تمہارے لیے متعین کیا ہے' اس کے لیے کرنے کا کام یہ ہے۔ اَنِ اشْکُرْ اس مقصد کے حصول کے لیے شکر کرو۔ اب یہ جو ''شکر'' کی بات ہے' میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ خدا کے کسی مقصد کے حصول کی بات نہیں ہے۔ سنیے' عزیزان من! کیا کہتا ہے اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ (31:12) اور اس کے بعد ہے کہ یاد رکھو! وَمَنْ یَّشْکُرْ (31:12) جو کوئی اس طرح سے شکر بجالاتا ہے فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ (31:12) وہ ہمارا کچھ کام نہیں سنوارتا' اپنی ذات کو سنوارتا ہے' اسی کے حسن میں اضافہ کرتا ہے' اسی کی صلاحیتوں میں نشوونما پیدا ہوتی ہے' وہ اپنا کچھ کام کرتا ہے اور آگے ہے کہ وَمَنْ کَفَرَ (31:12) جو اس سے انکار کرتا ہے'

اس کے خلاف جاتا ہے تو اس سے بھی ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (31:12) اللہ تمہاری ان چیزوں سے مستغنی ہے' وہ تو مستحق حمد وستائش چلا آ رہا تھا' اس وقت بھی جب نہ یہ کائنات موجود تھی' نہ تم انسان موجود تھے۔ اگر اس نے اپنے ہی کسی کام کے لیے یہ کچھ کرانا ہوتا' تو جب تم موجود نہیں تھے تو اس وقت تو پھر سارے ہی اس کے کام رکے رہتے۔ بالکل نہیں فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (31:12) یاد رکھو! خدا تو مستغنی ہے۔ تم سے بھی مستغنی ہے۔ اس میں تمہارا ہی کچھ سنورتا ہے۔ اس کے لیے' عزیزان من! بہت سے مقامات پیش کیے جا سکتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے ایک الگ درس نہیں' بلکہ قرآن کریم کی پوری تفسیر سامنے آنی چاہیے اور آپ دیکھیں گے آئندہ درسوں میں جو چیزیں آپ کے سامنے آئیں گی وہ انہی نکات کی وضاحت ہوگی۔ یہ قرآن کریم کے بنیادی نکات ہیں' کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے' یاد رکھو! یہ تمہارے ہی لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہر ہدایت انسان کی اپنی منفعت کے لیے ہی ہے

سورۃ الانعام کی آیت (6:104) غور سے سنیے۔ کہا کہ قَدْ جَآءَکُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ (6:104) تمہارے خدا کی طرف سے یوں کہیے سورج طلوع ہوا' روشنی پھیل گئی' راستے روشن ہو گئے۔ یہ اس نے کیا ہے لیکن اس روشنی دینے سے اور راستوں کو روشن کرنے سے اس کا کوئی اپنا مقصد نہیں ہے۔ کہا کہ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِہٖ (6:105) اب اس روشنی میں جو شخص آنکھیں کھول کر چلے گا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْھَا (6:105) جو آنکھیں بند کر کے چلے گا' وہ نقصان اٹھائے گا۔ اس کا نقصان اس کو ہو گا۔ نہ آنکھیں کھول کر چلنے والوں کے اس کام کا ہمیں کچھ فائدہ' نہ آنکھیں بند کرنے والے حضرات کا ہمیں کوئی نقصان ہے۔ اس لیے یہاں پہنچنے کے بعد آگے کہا کہ ہم انسانوں کو مار مار کے نہیں چاہتے کہ اس ایک راستے پہ چلیں اور ہم انسانوں سے یہ کہیں کہ یہ روشنی ہم نے عطا کی ہے' تو آنکھیں کھولو یا ہم زبردستی اس کی آنکھیں کھولیں۔ کہا کہ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ انسان کی بنیادی خصوصیت اس کا اختیار وارادہ ہے۔ اگر اس کا اختیار وارادہ اس سے سلب کر لیا جائے تو وہ تو انسانیت کی سطح سے نیچے گر جاتا ہے۔ ہمارا کام صرف یہ سمجھا دینا ہے کہ دوراہے پہ کھڑے ہو' یہ راستہ اِدھر جاتا ہے' یہ اُدھر جاتا ہے' راستے میں روشنی پیدا کر دی ہے۔ ہم نے سائن پوسٹ (نشان راہ) لگا دیئے اور اس کے بعد اگر تم صحیح راستے پہ چلو گے' منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے' غلط راستہ اختیار کرو گے تو پھر گمراہ ہو جاؤ گے۔ اس کے نقصانات تمہیں ہوں گے کیونکہ وَ مَآ اَنَا عَلَیْکُمْ بِحَفِیْظٍ (6:104) ہم تم پہ داروغہ نہیں ہیں۔ انسان اپنی ذات سے اپنے آپ کی بھلائی کے لیے چلتا ہے۔ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْھَا (39:41) اور جو غلط راستہ اختیار کرتا ہے اس کا نقصان بھی اسی کو ہوتا ہے وَ مَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ (39:41) ہم تم پر کوئی داروغہ مقرر نہیں ہوئے۔ ہمارا کوئی اپنا مقصد نہیں تھا جس کے لیے ہم نے تمہیں خاص راستے پہ چلانا تھا کہ تم نہیں چلتے تو ہم تمہیں مار مار کے ادھر چلائیں۔ تمہارے اپنے بھلے کی بات تھی۔ تم اپنا بھلا نہیں چاہتے

ہو تو ہم تمہیں مجبور نہیں کرتے۔ اس سے بھی آپ نے دیکھ لیا کہ خدا کا جو حکم ہے' جو ہدایت ہے' جو صحیح راستے ہیں' اس پہ چلنے سے خدا کا کوئی کام نہیں سنورتا' انسان کی اپنی ذات سنورتی ہے' اس کا اپنا ہی بھلا اس کے اندر ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے آخری الفاظ کہ خدا کی ذات میری بہترین رفیق ہے

عزیزانِ من! اب آگے چلیے۔ سورۃ العنکبوت میں ہے کہ وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ (29:6) جو بھی جدوجہد کرتا ہے' جو بھی ہمارے ہدایت کے مطابق' ہماری ڈائریکشن کے مطابق' جدوجہد کرتا ہے فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ (29:6) وہ اپنی ذات کے سنوارنے کے لیے یہ کچھ کرتا ہے اور اگلے الفاظ نے تو بات واضح کر دی کہ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (29:6) خدا تو تمام کائناتوں سے مستغنی واقع ہوا ہے۔ وہ اپنے لیے تم سے کچھ نہیں کرانا چاہتا' اس کو ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ کسی سے اپنے کام کرائے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ خدا تو اس وقت بھی خدا تھا' جب یہ کل کائنات کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس کے پروگرام اس وقت بھی سرگرمِ عمل چلے جا رہے تھے جب کوئی بھی موجود نہیں تھا' تو یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی پروگرام کی تکمیل کے لیے انسانوں سے کہتا ہے کہ تم یہ کرو اور تم وہ کرو۔ یہ نہیں ہے۔ وہ جو کہتا ہے تو ایک مشفق حکیم کی طرح' مصلح کی طرح' ناصح کی طرح' انسانوں کے بھلے کے لیے کہتا ہے۔ انہی کے فائدے کے لیے یہ بات کہتا ہے کہ ہم تم سے یہ کہتے ہیں کہ تم ایسا کرو گے تو تمہاری ذات سنور جائے گی' تمہاری زندگی حسین تر ہو جائے گی۔ کیا بات کہہ گیا ہے' عزیزانِ من! شعر تو فارسی کا ہے لیکن بڑا ہی جامع شعر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

حکایت قدِ آن یار دلنواز کنم

اس یارِ دلنواز کی میں باتیں کر رہا ہوں۔ اس لیے کہا ہے کہ آگے بات آئے گی' اس میں شریعت ہے۔

بایں بہانہ مگر عمر خود دراز لنم

مگر یہ کچھ اس کے قد کی تعریف کے لیے نہیں بلکہ اس بہانے سے میں خود اپنی عمر کو دراز کر رہا ہوں' اپنی درازیٔ عمر کے لیے میں اس کی یہ تعریفیں یا اس کا ذکر' یا اس کی داستان بیان کر رہا ہوں' تو یہ جو خدا کا ذکر' خدا کی داستان بیان کرنا ہے' یہ جو جسے ہم خدا کی عبادت' خدا کے احکام کی' اطاعت کہتے ہیں' تو یہ تو ''بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم'' کی بات ہے۔ عزیزانِ من۔ یہ شعر ہے۔ خدا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ

تیری جلوہ گاہِ جمال میں میرا ذوقِ دید نکھر گیا
تیری ضوفشانیٔ حسن نے میری حیرتوں کو سجا دیا

پہلے تو کہا تھا کہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

انسان ہزار سجدہ خدا کے لیے کرتا ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ اس سے دنیا بھر کی غلامیوں سے' محکومیوں سے' انسان چھوٹ جاتا ہے۔ ایک سجدے سے کیا ہوتا ہے۔ کسی اور نے کہا ہے:

تیرے سنگ در میں بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز نے
کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں میری جبین نیاز میں

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انسان کا ایک ایک سجدہ انسان کی جبین نیاز کو حسین سے حسین تر کرتا چلا جاتا ہے

اس کے سنگ در کے اوپر اگر پیشانی کو رکھا جاتا ہے تو اس میں نہ سنگ در کا کوئی مقصد ہے' نہ اس کے مالک کا کوئی فائدہ ہے۔ اس سے تو میری پیشانیوں میں' میری جبین نیاز کے اندر' ہزاروں عرش جھلکنے شروع ہو جاتے ہیں۔ انسان کی ذات' عزیزانِ من! آہستہ آہستہ علیٰ حد بشریت' صفاتِ خداوندی کا آئینہ بنتی چلی جاتی ہے۔ اگر آپ اس کا غلط مفہوم نہ لے لیں' چھوٹے پیمانے پر یہ انسان علیٰ حدِ بشرّیت خود خدا کا ایک نمونہ بنتا چلا جاتا ہے۔ اسی کا کچھ سنورتا ہے' خدا کا اس میں کچھ نہیں سنورتا۔ اور پھر یہ جو انسان کو وہ بار بار ہدایتیں دیتا ہے' تاکید کرتا ہے' اگر وہ غلط چلتا ہے تو کہتا ہے یٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ (36:30) میرے بندے! تو نے اپنے ہاتھ سے کیا کر لیا۔ کس کس قدر ہمدرد و مشفق ہے وہ! وہ یہ خود چاہتا ہے کہ انسان اس طرح بن جائے' ایسا بن جائے' اس مقصد پہ پورا اترے' اس قالب میں ڈھل جائے۔ یہ وہ خود چاہتا ہے۔ کیا کہہ گیا ہے وہ حسرت [1]! کیا شعر ہے! کہ

شعائے مہر خود بے داغ ہے جذبِ تمنا سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پرواز شبنم کی

جب بھی کوئی خدا کے قانون میں دخل اندازی کرے گا وہ مشرک کا مرتکب ہوگا

شعائے مہر تو خود یہ چاہتی ہے کہ اس قطرۂ آب کو' جسے اگر ایسے چھوڑ دیا جائے' تو وہ خاک میں' زمین میں گر جائے گا' خاک میں مل جائے گا' شانِ جبرائیل نصیب ہو جائے کہ وہ اعلیٰ اور اعلیٰ بلندیوں پہ اٹھتا ہوا چلا آئے اور ہماری جلوہ گاہِ جمال کے اندر آ کر اپنی ذات میں اور حسن پیدا کرتا چلا جائے۔ وَمَنۡ يَّشۡكُرۡ فَاِنَّمَا يَشۡكُرُ لِنَفۡسِهٖ [2] (31:12)۔ سورۃ لقمان ہی میں آگے ہے کہ يٰبُنَىَّ

---

[1] فضل الحسن حسرت موہانی (1875-1951)

[2] جو نعمائے خداوندی کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے' اس کی ذات کی صلاحیتیں بھرپور انداز سے نشوونما پاتی ہیں۔

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (31:13) اے میرے بیٹے! خدا کی محکومیت میں کسی اور کو شریک نہ کرنا' یاد رکھو! شرک ظلم عظیم ہے۔ میں نے شاید پہلے کسی درس میں بتایا ہے کہ عربی زبان میں ''ظلم'' کے معنی ہوتے ہیں ''جس مقام پر کسی کو ہونا چاہیے اس کا اس مقام پر نہ ہونا'' تو کہا یہ ہے کہ شرک ایک ایسا ظلم ہے اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں ہوسکتا۔ دیکھیے' عزیزانِ من! دونوں طرف سے' کس طرح وہ شے جس مقام پہ ہونی چاہیے' وہ وہاں نہیں رہتی۔

شرک کے معنی ہیں ''خدا کی محکومیت میں کسی اور کو شریک کرنا' خواہ وہ انسان کے اپنے جذبات ہی کیوں نہ ہوں' کسی اور کو شریک کرنا''۔ جونہی آپ نے کسی اور کو وہ مقام دے دیا جو مقامِ خداوندی ہے تو خدائے واحد اپنے مقام پہ نہ رہا' اس سے نیچے گر گیا یعنی اس کے ساتھ ایک اور ساتھی بھی آ گیا۔ خدا کی خصوصیت تو یہ ہے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ [1] (112:1) وہ اپنے مقام میں منفرد ہے' کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ جونہی آپ نے اس کے ساتھ ایک اور شریک کیا' خدا اپنے مقام پہ نہ رہا اور دوسری طرف' عزیزانِ من! انسان کا شرف اس میں ہے کہ وہ دنیا میں کائنات کی کسی قوت کے سامنے نہ جھکے' اس لیے کہ کائنات کو تو اس کے لیے تابع تسخیر کیا گیا ہے' مسخر کیا گیا ہے' یہ مسجودِ ملائک ہے' یہ سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے چاہئیں۔ یہ پہلی چیز ہے۔

اگر کائنات کی کسی قوت کے سامنے جھک گیا تو اس کا وہ مقام نہ رہا جو ہونا چاہیے اور اگر آگے بڑھا اور کسی انسان کے سامنے جھک گیا تو پھر بھی مساواتِ انسانیت کے مقام سے گر گیا۔ تو شرک میں نہ خدا اپنے مقام پہ رہا' نہ انسان اپنے مقام پہ رہا اور انسان تو اس شرک میں ایسی ذلتوں اور پستیوں میں گرتا ہے کہ اقبالؒ (1938-1877ء) کے الفاظ میں پھر یوں ہوتا ہے:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے' نہ من تیرا نہ تن [2]

قصہ ختم ہوا' اس کے بعد کوئی انسان ہی نہیں رہتا۔ اس میں یہ ہے کہ یہ جو عبادت ہے' یہ خدا کی عبودیت ہے' خدا کے قوانین کی اطاعت ہے' تو عزیزانِ من! یہ اطاعت انسان کی اپنی ذات کو سنوارنے کے لیے ہے' اس میں نشوونما پیدا کرنے کے لیے ہے' اس کے حسن کو نکھارنے کے لیے ہے' خدا کا اس میں کوئی کام نہیں ہوتا۔

---

[1] اس کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء' سورۃ الاخلاص۔

[2] اقبالؒ: بال جبریل۔

قصۂ ابلیس و آدم کی اصل حقیقت

اب ایک قدم آگے بڑھیے۔ میں نے کہا تھا کہ شرک میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انسان خود اپنے جذبات کا محکوم بن کر رہ جائے' اپنی بے مہار' بے زمام' خواہشات کی اطاعت کرنے لگ جائے۔ اسی سے خدا کے قوانین کی سرکشی ہوتی ہے اور اسی سرکشی کی جو کیفیت ہے' اسے قرآن نے شیطان کہہ کر پکارا ہے۔ میں آگے چل کر قصہ آدم میں یہ بتاؤں گا کہ یہ ابلیس اور شیطان' خارج میں کوئی ہستیاں نہیں ہیں' یہ انسان کی اپنی ہی کیفیت کا نام ہے۔ تو جہاں شیطان کا لفظ ہے' اس کے لیے میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان کے اپنے جذبات جب اقدارِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر لیتے ہیں تو اسے قرآن شیطان کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے **اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ** (36:60) اے نوعِ انسانی! کیا ہم نے تم سے یہ بات نہیں کہی تھی کہ تم نے شیطان کی عبودیت اختیار نہیں کرنی۔ اگر اس عبودیت' عبادت کے معنی پرستش لیے جائیں تو یہاں بات ہی کوئی نہیں بنتی۔ شیطان کی تو کوئی پرستش نہیں کرتا۔ شیطان خود انسان کے سرکش جذبات ہیں۔ تم سے یہ کہا گیا ہے کہ کائنات کی قوتوں کے سامنے نہیں جھکنا' اپنے جیسے انسانوں کے سامنے نہیں جھکنا اور یہ کہ خود اپنے سرکش جذبات کے سامنے بھی نہیں جھکنا۔ انہیں اقدارِ خداوندی کے ساحلوں کے اندر رکھنا۔ کہا یہ گیا تھا کہ **اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ** (36:60) ان کی عبودیت اختیار نہ کرنا بلکہ **وَ اَنِ اعْبُدُوْنِيْ** (36:61) صرف میری محکومیت اختیار کرنا لہٰذا یہ صراط مستقیم ہے۔ صراطِ مستقیم کا تذکرہ آگے آتا ہے۔ یہ یہی سورۃ الفاتحۃ میں **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (1:5) ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ اپنے جذبات کو کبھی سرکش نہ ہونے دو بلکہ یہ کہا کہ انہیں بھی ہمارے قوانین کے تابع رکھنا۔ یہ ہیں معنی کہ شیطان کی عبودیت اختیار نہ کرنا بلکہ **وَ اَنِ اعْبُدُوْنِيْ** (36:61) صرف میری محکومیت اختیار کرنا' لہٰذا **هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ** ہے۔

طاغوت کا مفہوم

قرآنِ کریم نے ایک اور اصطلاح بھی استعمال کی ہے اور وہ ہے طاغوت۔ طاغوت کے معنی ہیں ''ہر وہ قوت جو خدا سے سرکشی اختیار کرے۔'' انسان کی اپنی ذات یا کوئی اور دوسرے انسان' یعنی جہاں بھی کوئی قانون' کوئی نظام' کوئی حکومت خود انسان کی اپنی ذات' خدا کے قوانین سے سرکشی اختیار کرے گی تو اسے قرآن طاغوت کہہ کر پکارتا ہے۔

ان تصریحات سے آپ نے سمجھ لیا' عزیزانِ من! کہ خدا کی عبادت کے معنی ہیں ''اس کی محکومیت اختیار کرنا' اپنے ہر معاملات کے فیصلے اس سے لینا'' اور اس سے لینے کے معنی ہوں گے ''اس کی کتاب سے لینا'' کیونکہ اس نے کہا ہے کہ **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ**

اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ..... ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ..... ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (42;43;44) یہ جو بھی خدا کی کتاب کے سوا کہیں اور سے فیصلے لیتا ہے' جو بھی اس کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا' یہی لوگ ہیں جن کو فاسق کہا جاتا ہے' ظالم کہا جاتا ہے حتیٰ کہ کافر کہا جاتا ہے۔ تو اصل چیز ہے اپنے معاملات کے فیصلے کہاں سے لیے جائیں' کس قانون کی اطاعت کی جائے؟ یہ ہیں وہ خدا کی عبودیت یا عبدیت کے معنی۔ اب دیکھیے وہ اس کے مقابلے میں دوسری بات کیا کہتا ہے۔ ابھی ابھی میں نے کہا تھا کہ یہ جو طاغوت یا سرکش جذبات یا سرکش قوتیں ہیں' اُن کے لیے قرآن نے کہا تھا کہ ان سے اجتناب برتنا' ان کے تابع نہ ہو جانا۔ کہا کہ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (4:60) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پہ کبھی غور کیا ہے کہ بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو صاحب الحمدللہ مسلمان ہیں' صاحبِ ایمان ہیں' اللہ کی کتاب پہ ایمان لائے' اس سے پہلی کتابوں پہ ایمان لائے' ہم تو بالکل صاحب ایمان ہیں؟ اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ. (4:60) چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خداوندی قوتوں سے جا کر کرائیں' حکومت ان کی قبول کریں' محکومیت ان کی اختیار کریں' قوانین ان کے لائیں' ان کے تابع اپنے معاملات کو طے کریں۔ آپ نے دیکھا' عزیزانِ من! قرآن نے بات کیسے واضح کر دی وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ (4:60) حالانکہ تم سے کہا گیا تھا کہ ان قوتوں سے سرکشی برتو اور محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو۔ ان مقامات سے' عزیزانِ من! آپ دیکھ لیجیے کہ جب ایک عبد مومن کہتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں' تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ بہت بڑا نعرۂ انقلاب ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے لا الہ الا اللہ کہا جاتا ہے یعنی کوئی صاحب اقتدار نہیں سوائے خدا کے۔ یہ تو ایک حقیقت کا اظہار اور اعلان ہوا اور اس کے بعد یہ کہا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم عملاً بھی ایسا ہی کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی اور کے قانون کی' کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کرتے ہم عملاً یہی کرتے ہیں:

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری!

ہمارے ہاں ہر نماز میں "ایاک نعبد" کے اعلان کی عملی کیفیت

اب اس کے بعد آپ سوچیے' عزیزانِ من! کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کو یعنی سورۃ الفاتحۃ نماز کی ہر رکعت کے اندر ہم پڑھتے ہیں اور اس ہر رکعت میں ہم یہ اعلان کرتے ہیں' باوضو مسجد میں کھڑے ہو کر' منہ طرف قبلہ شریف کہہ کر نماز میں اعلان کرتے ہیں کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم تیرے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہیں کرتے' کسی کی اطاعت نہیں کرتے' صرف تیری اطاعت کرتے ہیں اور اس کے بعد ہمارا عمل کیا ہے۔ عزیزان من! یہ تمام فیصلے ہم غیر اللہ کے قانون کے تحت کرتے ہیں۔ نہ نظام خدا کے قانون کا' نہ حکومت

خدا کے قانون کی' نہ اطاعت خدا کے قانون کی۔ عجیب چیز ہے' عزیزانِ من! اور اس کے باوجود اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کتنا بڑا فریب ہے جو ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں! خدا تو کہتا ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (2:9) وہ اس طرح خدا کو اور مسلمان' جماعت مومنین کو فریب دے دیتے ہیں۔ وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ (2:9) حالانکہ یہ اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں' خدا کو کیا فریب دیں گے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! خود فریبی اس میں ہے کہ وہ جو دین کے نظام کے شعائر اور ارکان تھے' وہ جو اس نظام کو قائم کرنے کے لیے' محسوس طور پر ایک پروگرام تھا' اس کو اسی طرح سے قائم رکھا جاتا ہے' مگر ہوتا یہ ہے کہ مذہب کے اندر اقیموا الصلوٰۃ نماز پڑھو بنتا ہے۔ نماز کی رکعتیں نماز کا قیام' رکوع' سجود یہ سارا کچھ اسی طرح سے قائم رکھا جاتا ہے۔ صیام یعنی روزہ اسی طرح سے ہے' کہ کس وقت کھانا چاہیے' دن بھر یہ کرو شام کو پھر افطار کرو' پھر یہ کرو' وہ اسی طرح سے مراسم ادا کیے جاتے ہیں۔ حج بھی ایک بہت بڑا اجتماع رہ گیا ہے۔ وہ بھی ایک رسم ہے' جس کو ہم ادا کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں دین کے نظام کے اہم رکن تھے۔ یہ اس مشین کے اہم پرزے تھے۔ وہ نہ نظام باقی ہے نہ وہ مشین باقی ہے' نہ وہ پروگرام باقی ہے۔ ان چیزوں کو ہم اس شکل میں قائم رکھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ ہم دین کے نظام پہ چل رہے ہیں۔

فوج کے اندر کسی سپاہی کا صرف ہر آن چوکس و چوبند رہنا ہی مقصود بالذات نہیں ہوتا

وہ جو میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ فوج میں جو ایک سپاہی ہے' اس کے لیے ایک پروگرام مقرر کیا جاتا ہے' اس کے لیے قاعدے مقرر کیے جاتے ہیں' ضابطے مقرر کیے جاتے ہیں' ان قواعد و ضوابط کی جزئیات تک کی یہ کیفیت ہے کہ اس میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک سپاہی اپنے بوٹ کے تسمے کس طرح سے بند کرتا ہے' اپنی پیٹی کس مقام پر لگاتا ہے' اپنے بٹن کس طرح بند کرتا ہے' بندوق کو اٹھاتا کیسے ہے' قدم کیسے اٹھاتا ہے' چلتا کیسے ہے' رکتا کیسے ہے' یہ سب کچھ اس سے کرایا جاتا ہے۔ اگر وہ ذرا بھی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے قانون شکنی کہا جاتا ہے۔ اس کی اسے سزا ملتی ہے۔ اس کی پابندی کی اتنی اہمیت ہے۔ فوج کے اندر پوری زندگی بھر اس کو یہ کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن یہ چیز مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ ان تمام قواعد اور ضوابط کی پابندیوں سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس قابل ہو جائے کہ کل کو اگر اسے اپنے دین کی حفاظت کے لیے' اپنے مملکت اور ملک کی حفاظت کے لیے' میدانِ جنگ میں نکل کر جان بھی دینی پڑے' تو بے دریغ جان دے دے۔ مقصد یہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ ساری جزئیات طے کی جاتی ہیں' ان تمام چیزوں کی پابندی کرائی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی زندگی میں ساری عمر یہ موقعہ آئے ہی نہیں' اس کے باوجود اس کو پابندی ساری عمر کرنا پڑتی ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ اس غایت اور اس مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے' مقصود بالذات نہیں ہے لیکن اگر نہ کوئی مملکت رہے' نہ اس کی فوج رہے' نہ اس کے اختیار رہیں لیکن ایک سپاہی اپنی وردی لے کر اپنے گھر آ جائے اور وہ ہر روز صبح اٹھ کر اسی طرح وردی پہنے' بوٹ کے تسمے کسے' بٹن بند کرے'

بندوق تو نہیں ہے اس کی بجائے ایک ڈنڈا ہی لے لے اور اسے لے کر گاؤں کی گلی میں لیفٹ رائٹ کرتا رہے' وہی 45 منٹ کی جو پریڈ تھی وہ یہاں کرتا ہے' التزاماً کرتا رہے' باقاعدہ کرتا رہے' تو سوچیے عزیزانِ من! کیا یہ اس غایت کو پورا کر رہا ہے جس کے لیے فوج کے سپاہی کی حیثیت سے اس سے یہ کچھ کرایا جاتا تھا؟ عزیزانِ من! فوج میں یہ کچھ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا' یہاں یہ کچھ اس نے مقصود بالذات سمجھ لیا ہے۔ بس یہ فرق ہے' دین اور مذہب میں۔ مذہب میں دین کے نظام کے ارکان وغیرہ قائم رکھے جاتے ہیں' ان کی پابندی کرائی جاتی ہے۔ اُن مراسم کی پابندی کرائی جاتی ہے' جن کی غایت اور مقصد سامنے نہیں ہوتا لیکن جب وہ نظام دین قائم ہوتا ہے تو یہی ارکان ہوں گے' یہی صلوٰۃ ہوگی' یہی اطاعت ہوگی' یہی صیام ہوگا' یہی الحج [1] ہوگا لیکن یہ ایک نظام کے پروگرام کے اجزا ہوں گے۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہوں گے۔ نظامِ دین میں ایک جماعت کو' ایک فرد کو' اس کی ذات کی صلاحیت کی نشوونما سے ایک پوری جماعت کو' اس کے اندر ایک ڈسپلن پیدا کر کے' اس کے اندر اخلاق حسنہ پیدا کر کے' انہیں اقدار کا پابند بنا کر' بلند مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ بنایا جاتا ہے تو اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کے معنی کی تعبیر ابھرتی ہے۔ آپ ''تعبیر'' کا لفظ سامنے رکھیے کہ ایک وحشی جانور کو سدھایا جاتا ہے تاکہ وہ قاعدے اور قانون کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو استعمال میں لائے' اپنے مقصد کے لیے نہیں بلکہ اس مقصد کے لیے لائے جو اس تربیت کا مقصود تھا۔ اچھا سدھایا ہوا گھوڑا ابھی اگر آپ نے ٹانگے میں جوت لیا ہے اور آپ اسے ریلوے اسٹیشن کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور وہ سرکش ہو کر الٹی طرف ماڈل ٹاؤن کی طرف چل پڑتا ہے 'تو یہ بھی اس کا سدھانا' اس کی صلاحیتوں کا نشوونما پانا' اس غایت کو پورا نہیں کرتا' جو اس کا نصب العین سامنے رکھا گیا ہے' جو منزل اس کے سامنے رکھی گئی ہے' اس تک پہنچنے کے لیے' یہ تو ان صلاحیتوں کو نشوونما دینا ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! عبادت سے مفہوم' یہ ہے خدا کا عبد ہونا اور یہ ہے مقصد اس اعلان کا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم تیرے سوا کسی اور قاعدے قانون کی پابندی نہیں کرتے۔ یہ سورۃ الفاتحۃ کی چوتھی آیت کا پہلا ٹکڑا اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہمارے سامنے ابھی آیا ہے۔ اگلا ٹکڑا وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) ہے۔ یہ ایک بات ہمیں اس سے اور آگے لے جاتی ہے۔ یہ موضوع بہت گہرا بھی ہے بہت وسیع بھی ہے۔ اس لیے ہم اسے اگلے درس پر اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀.....❀

---

[1] اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویزؒ

ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟

سلیم! میرے مضامین پڑھ کر جو خیالات تمہارے دل میں پیدا ہوئے وہ بالکل فطری ہیں اور ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو قرآن کریم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرتا ہے اور جس کی نگاہ ان حقائق کی متلاشی ہوتی ہے جنہیں خدا نے اس کتاب مبین میں بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے اور جو قوموں کی تباہی و بربادی اور فوز و فلاح کے لئے غیر متبدل اور اٹل قوانین ہیں۔ تم میرے مسلک سے واقف ہو۔ میں قرآن کو مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ تمام نوع انساں کی انفرادی اور اجتماعی مشکلات کا واحد حل اور زندگی کے مصائب و آلام کا حتمی علاج سمجھتا ہوں اور میرا یہ عقیدہ محض خوش فہمی پر مبنی نہیں بلکہ میں علیٰ وجہ البصیرت اس کا یقین رکھتا ہوں' ایسا یقین جو وجہء طمانیت قلب اور باعث تسکین روح ہوا کرتا ہے' نہ کہ توہم پرستی کا پیدا کردہ فریب نفس جسے یقین اور اطمینان کا نام دے دیا جاتا ہے۔

تم پوچھتے ہو' اور ایسا پوچھنے میں تم بالکل حق بجانب ہو' کہ جب مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت آج نمازیں بھی پڑھتی ہے' روزے بھی رکھتی ہے' زکوٰۃ بھی دیتی ہے' حج کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے' تو ان اعمال کا وہ نتیجہ مرتب کیوں نہیں ہوتا جو عہد محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ (حضور نبی ءاکرمؐ اور صحابہؓ کے عہد) میں ہوتا تھا۔ چونکہ تم فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ اصطلاحات میں الجھنے کے عادی نہیں' اور نہ ہی یہ طریق ان حقائق کو سمجھنے کے لئے چنداں مفید ہوتا ہے' اس لئے تمہیں کھلے کھلے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ آج ہمارے یہ ''اعمالِ حسنہ'' کیوں بے نتیجہ رہتے ہیں۔

سلیم! ذرا غور کرو کہ جاڑے کا موسم ہے۔ سخت سردی کا دن۔ شام کے قریب' جبکہ آفتاب کی شعاعوں میں تمازت باقی نہیں رہی' رحمتؔ کی بیوی اپنے خوردسال بچوں کو لے کر اپنی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بیٹھی ہے۔ رحمتؔ کی بیوی کو تم جانتے ہو؟ تم بچپن میں ان کے ہاں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ عمر کا تقاضا تھا کہ اس کے چہرے پر شگفتگی و

شادابی ہوتی۔لیکن مسلسل فاقوں نے اسے ایسی افسردگی اور پژمردگی میں بدل دیا تھا کہ وہ ایک اجڑا ہوا بہشت معلوم ہوتا تھا جس پر سوائے نورِعصمت کے (جو ہر ایسی پاک دامن بی بی کے چہرے پر ہونا چاہئے) رونق اور زندگی' تازگی اور بشاشت کا کوئی نشان تک باقی نہ تھا۔ ہاں! وہ اپنے بچوں کو لے کر چولہے کے قریب آ بیٹھی۔خشک ٹہنیاں' سوکھے ہوئے پتے' خس و خاشاک' دوپہر کو اکٹھا کر لائی تھی۔انہیں سلگا دیا تاکہ بچے آگ تاپتے رہیں۔لیکن بچوں کو تو سردی سے زیادہ بھوک ستا رہی تھی۔اس نے ان کے پیہم معصوم تقاضوں سے مجبور ہوکر ہنڈیا میں خالی پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا اور یوں' ان ننھے بچوں کو نہیں! خود اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ ہر آہٹ پر کان اور ہر جنبش پر نگاہ تھی۔ بچے اور ان کی ماں رہ رہ کر گلی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سورج ڈوب گیا تو گلی کے دوسرے کنارے سے رحمت آتا دکھائی دیا۔ ننگے پاؤں' پنڈلیاں گردوغبار سے اٹی ہوئی' گھٹنوں تک پرانا تہمد' پھٹا ہوا گاڑھے کا کرتا جس کی آستینیں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں۔بس' اس شدت کے جاڑے میں یہی کل کائنات' چہرے پر زردی چھائی ہوئی' ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں' گھر کی طرف قدم اٹھاتا' لیکن قدم بمشکل اٹھتا۔ دروازے کے قریب آیا تو بیوی نے خاموشی سے بسم اللہ کہہ کر استقبال کیا۔ دونوں بچے ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بیوی نے ایک حسرت بھری نگاہ میاں کے افسردہ چہرے پر ڈالی۔اس کی غم آلود آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ مجھے تو آج بھی کہیں مزدری نہیں ملی۔ دن بھر ادھر ادھر پھرتا' لوگوں کی منتیں خوشامدیں کرتا رہا لیکن کوئی کام نہ مل سکا۔

عین اس وقت سامنے کی مسجد میں خواجہ صاحب کی طرف سے دو ہزار روپے کا گراں بہا قالین بچھایا جا رہا تھا اور نمازی اسلام کی شوکت وعظمت پر ایک دوسرے کو مبارک باد اور خواجہ صاحب کو جنت کی بشارتیں دے رہے تھے۔

☆☆☆

سلیم! تم عنایت اللہ کو جانتے ہو نا! وہ تمہارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔کس قدر ذہین اور کیسا شریف بچہ تھا؟ لیکن بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔اس کی ماں دن بھر محنت مزدوری کرتی اور بچہ کی پرورش کا سامان مہیا کرتی۔ لیکن جب مزدوری مردوں کو نہ مل سکے تو عورتوں کو مزدوری کہاں سے ملے؟ میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ صبح مدرسے جاتے وقت ماں نے بچہ کو چھاتی سے لگایا۔آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔لیکن دل کو کڑا کر کے بیٹے کو تسلی دی کہ مدرسے سے ہو آؤ۔بس تمہارے آنے پر روٹی تیار ملے گی۔ میں ابھی پکاتی ہوں۔جاؤ میرا بیٹا! خدا حافظ!

سلیم! اگر ہمت ہو تو اس ماں کے دل کی

گہرائیوں میں اتر کر دیکھو کہ بیٹے کو یوں بھوکا مدرسے بھیجتے وقت اس کے سینے میں کس قیامت کے جذبات غم وحزن کا طوفان برپا ہوگا۔ وہ غربت و فلاکت کا مجسمہ چپکے سے مدرسے چلا گیا۔ شام کو آیا۔ ماں گھر پر نہ تھی۔ شاید دانستہ باہر چلی گئی ہوگی کہ بھوکے بیٹے کو کس طرح دیکھ سکے؟ عنایت اللہ نے اندر آ کر سب سے پہلے روٹی والے رومال کو کھولا تو اس میں کچھ نہ تھا۔ خاموش باہر چلا گیا۔ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ سامنے خان صاحب کے مکان میں سینکڑوں مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ متنوع پھل، قسم قسم کی مٹھائیاں میزوں پر چنی رکھی تھیں کہ آج خان صاحب کے بچے کی پہلی افطاری کی تقریب تھی۔ یہ دو وقت کا بھوکا یتیم، انہیں دیکھتا ہوا چلا گیا کہ چوک میں کچھ بوجھ مل جائے تو ایک پیسے کے چنے لے سکے۔

☆☆☆

سلیم! تم نے مائی بھولی کو دیکھا ہے؟ وہ اندھی بڑھیا جو پاگل ہو رہی ہے۔ لیکن تم نے اس کے بیٹے کو شاید نہیں دیکھا۔ اٹھارہ سال کا نوجوان بیٹا۔ اس کا باپ مدت ہوئی چالی پر سے گر کر مر گیا تھا۔ عمارت بنوانے والے نے دوسرے دن اور مزدور کام پر لگا لیا اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی کہ کس کا سہاگ لٹ گیا اور کون یتیم ہو گیا۔ اس بچہ کو مائی بھولی نے بڑی مشقت سے چرخہ کات کات کر پالا تھا۔ جس سال بڑے زور کا انفلوئنزا پھیلا تھا، وہ لڑکا بھی بیمار ہو گیا۔ محلّہ میں ایک حکیم جی تھے۔ وہ غریبوں کو نسخہ مفت لکھ دیا کرتے تھے۔ بھولی وہاں سے نسخہ تو لکھوا لائی لیکن اٹھنی کے پیسے پاس نہ تھے کہ دوائی خرید سکے۔ سلیم! باور کرو کہ اس نے محلے کے ایک ایک گھر میں جا کر منتیں کیں کہ کہیں سے کچھ پیسے قرض مل جائیں۔ لیکن کسی نے کچھ نہ دیا۔ نسخہ ہاتھ میں تھا اور سامنے جوان بیٹا جان توڑ رہا تھا۔ بچارا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہ اس دن کا واقعہ ہے جس دن حاجیوں کی اسپیشل ٹرین روانہ ہوئی تھی اور سینکڑوں روپوں کے پھول اسٹیشن پر بکھرے پڑے تھے۔

☆☆☆

اور تم نے رضیہ بچاری کا پیغام تو اگلے دنوں خود اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ اسے جوان بھائی کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے لیکن اس کے پاس اتنے کپڑے نہیں کہ تن ڈھانپ کر گھر کی چار دیواری سے باہر نکل سکے۔ جب اس نے کپڑے بھی مستعار مانگے تھے تو ظاہر ہے کہ بچاری کے پاس زادِراہ کیا ہوگا۔ اس نے گاؤں کے چوکیدار کو کہلا بھیجا کہ وہ اس کے ساتھ جائے لیکن جب اسے معلوم تھا کہ رضیہ کے پاس کچھ نہیں تو وہ بلا اجرت کیسے ساتھ چلا جاتا؟ گاؤں میں دور نزدیک کے رشتہ دار بھی تھے لیکن کسے فرصت تھی کہ اس کی مصیبت میں اس کے ساتھ ہو لے؟ سارا گاؤں فتو خاں نمبردار کے لڑکے کی شادی کی تیاری میں مصروف تھا۔ غریب اکیلی، چلچلاتی دھوپ میں

پیدل روانہ ہوگئی کہ مرنے والے کا منہ تو دیکھ لے۔ (یہ وہی رضیہ تھی جس نے بچپن میں اپنے مرحوم باپ کی معیت میں جو (''شمش العلماء'' تھے' دو حج کئے تھے)۔ اور یہ اس گاؤں کا واقعہ ہے جس کے مسلمان مذہبی معاملات میں اپنے کٹر پن میں مشہور ہیں۔ لیکن وہ ''مذہبی معاملات'' کیا ہیں؟ ذرا سن لو۔ مقلد اور غیر مقلد کے جھگڑے تو وہاں شروع سے چلے آتے تھے۔ اس دفعہ جو میں وہاں گیا ہوں تو ایک اور جھگڑا سننے میں آیا۔ خود مقلدوں کے ہاں بھی دو پارٹیاں بن رہی تھیں اور آپس میں سر پھٹول تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک ''عظیم الشان'' مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے یہ تنازعہ پیدا ہوا ہے۔ کہیں سے ایک مولوی صاحب تشریف لائے۔ یہ مولوی صاحب بقول ایک گروہ کے بہت ''بھاری'' مولوی تھے۔ تین تین کوس تک ان کی آواز جاتی تھی۔ انہوں نے مسئلہ بیان کیا کہ مسجد کی شان رسولؐ اللہ کی شان سے بڑی ہے۔ کیونکہ رسولؐ اللہ خود مسجد میں چل کر آتے تھے اور مسجد کبھی ان کے پاس چل کر نہیں جاتی تھی۔ گاؤں کے مولوی صاحب کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ رسولؐ اللہ کی شان کو مسجد کی شان سے بڑا سمجھتے تھے۔ پھر کیا تھا' دو پارٹیاں بن گئیں۔ باہمی جھگڑے ہوئے' لڑائیاں ہوئیں' مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ قریب سال بھر ہوگیا یہ آگ آگے ہی آگے بڑھتی جارہی ہے اور ہر فریق اس مساعی حسنہ کو ''جہاد عظیم'' قرار دے رہا ہے۔

اسی باہمی تشتت وانتشار کا نتیجہ ہے کہ کھیت ویران ہورہے ہیں۔ فصلیں تباہ ہوچکی ہیں۔ زمین کا بیشتر حصہ سکھوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ بقایا رہن رکھا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد تم دیکھو گے کہ سکھ تمام گاؤں کے مالک بن جائیں گے اور یہ ''دین دار'' مسلمان ان کے مزارعہ ہو جائیں گے۔ اس پر مولوی صاحب انہیں مبارک باد دیں گے کہ انہوں نے یہاں کی زمین بیچ کر بہشت میں مکان خرید لیا۔ اس لئے یہ سودا خسارے کا نہیں۔

تم کہو گے کہ یہ تو جہلا کی باتیں ہیں۔ لیکن تمہیں وہ خطبہء جمعہ بھی تو یاد ہوگا جو شہر کی جامع مسجد میں شعبان المعظم کے مبارک مہینے کی تقریب پر تم نے خود سنا تھا۔ جناب خطیب نے' جو خدا کے فضل سے دیوبند کے فارغ التحصیل مولوی صاحب ہیں اور جن کے پاس اپنے بیان کی تائید میں سینکڑوں حوالے بھی موجود تھے' یہی فرمایا تھا نا کہ ''شب برات'' ایک ایسی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ پکار پکار کہتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے جو جی میں آئے مانگیں۔ میں ہر ایک کی طلب کو پورا کروں گا۔ لہٰذا جس شخص نے اس رات میں پچاس نفل پڑھ کر مغفرت کی دعا مانگ لی اس کی نجات کا اللہ تعالیٰ خود ذمہ ہے''۔ اس کے بعد تمہیں یاد ہوگا کہ مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انہوں نے فرمایا تھا کہ رحمت خداوندی کے اس بحر ذخار میں ہر ایک کا حصہ برابر ہوگا۔ لیکن ایک سوختہ بخت اس سے محروم رہ

جائے گا۔ لوگوں کی آنکھیں اوپر کو اٹھیں کہ معلوم کریں کہ وہ کون بدنصیب ہوگا جو ابر رحمت کی ایسی گہر باری سے فیض یاب نہ ہو سکے گا؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہاں ایک' اور صرف ایک شخص اس رحمت سے محروم رہ جائے گا۔ یعنی وہ جس کا پاجامہ اس کے ٹخنوں سے نیچے ہوگا۔ یہ تو سلیم! ''جہلا'' کی باتیں نہ تھیں اور نہ ہی مولوی صاحب یہ کچھ اپنی طرف سے بیان کر رہے تھے۔ انہیں یہ سب کچھ ''عین اسلام'' کہہ کر پڑھایا گیا تھا اور وہ اسی کو ''عین اسلام'' سمجھ کر آگے پہنچا رہے تھے! ہاں! تو میں تمہیں رضیہ بی بی کی بپتا کی داستان سنا رہا تھا اور ایک رضیہ ہی پر کیا موقوف ہے۔ ذرا اپنے گردوپیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ اس قسم کے کتنے واقعات ہر روز تمہارے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔ سو عزیزم! جس سوسائٹی کا نظام یہ ہو اس کے متعلق یہ سوال اٹھانا کہ ان کی نمازیں اور ان کے روزے' ان کی زکوٰۃ اور ان کے حج یعنی ان کے ''اعمال حسنہ'' وہ نتائج کیوں نہیں پیدا کرتی جو ہونے چاہئیں تھے' کچھ تعجب انگیز نہیں۔ سلیم! میں پھر کہتا ہوں اور تم اسے غور سے سمجھنے کی کوشش کرو کہ اسلام ایک نظام زندگی ہے۔ دنیا کے مذاہب جن میں انسانی تصرفات ہو چکے ہیں' مذہب کو محض انفرادی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام ایک ایسا معاشرہ (سوسائٹی) قائم کرنا چاہتا ہے جو نوع انسان کی ربوبیت (پرورش) کا ذمہ لے۔ اس مقصد عظیم کے لئے اسلام ہر عبد مومن کو اس کارگہ حیات کی عظیم الشان مشینری کا اہم اور کارآمد پرزہ قرار دیتا ہے جس کی ہر حرکت اور جنبش کا اثر تمام مشینری پر پڑتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ صالح (محکم اور درست) ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مشینری بھی ایک ضبط و ربط کے ماتحت چلے اور اس کا جیتا جاگتا نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آجائے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ الگ پڑے رہیں تو خواہ ان میں سے ہر ایک پرزہ الماس و یاقوت کا کیوں نہ ہو' مشینری بیکار ہو جائے گی۔ آج ہماری مشینری بیکار ہو رہی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس عملی رہبانیت کا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی ہے۔ سلیم! غور سے قرآن کریم کا مطالعہ کرو تو تم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ کسی قوم پر ذلت و مسکنت اور افلاس و نکبت کا چھا جانا اور پھر اس قوم کا اس حالت پر مطمئن ہو جانا' خدا کا غضب ہے' اللہ کا عذاب ہے۔ اور یہ تو تم سمجھتے ہی ہو کہ ایک مغضوب علیہ قوم محض بے روح نمازوں اور رسمی روزوں کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منعم علیہ قرار نہیں دے سکتی۔ جب اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح سے استخلاف فی الارض کی زندگی عطا کرے گا تو ظاہر ہے کہ جس ایمان و عمل کا نتیجہ شوکت و عظمت' تمکن و استخلاف نہیں (یا وہ اس حالت کی طرف رفتہ رفتہ نہیں لئے جا رہے) وہ ایمان' ایمان اور وہ عمل' عمل صالح نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا تم کسی اور نتیجے تک پہنچ ہی نہیں سکتے' کیونکہ اللہ کے

وعدے تو بہرحال سچے ہیں اور اس کا قانون اٹل۔ سلیم! ذرا انسانیت کے معراج کبریٰ' یعنی دور رسالتؐ کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ وہ کون سا خاص پروگرام تھا جسے کانفرنسوں اور انجمنوں نے مرتب کر کے قوم کے سامنے رکھا تھا؟ یہی نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ ہی تو تھا جس نے چند سال کے عرصے میں نہ صرف اس قوم کی تمدنی' اخلاقی اور معاشرتی حالت ہی میں انقلاب پیدا کر دیا' بلکہ ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی اور کھجوروں کے ستو کھا کر گزارہ کرنے والی قوم' قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی وارث بن گئی۔ ان ہی سیدھے سادے اعمال نے ان کے اندر وہ انقلاب پیدا کر دیا جو ایک مرد مومن کی نگاہ میں تقدیریں بدل دینے والی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تمام اعمال درحقیقت مختلف اجزاء تھے اس پروگرام کے جس کا عنوان (یعنی مقصود آخر) قرآن کے پہلے چار الفاظ پر مشتمل ہے۔ یعنی **الحمد لله رب العلمين** ۔ وجہء ستائش اللہ کا وہ پروگرام (نظام) ہے جو دنیا میں خدا کی ربوبیت عامہ (نوع انسان کی پرورش و تربیت) کا مظہر ہے۔ لہٰذا' جو اعمال اس نظام کے قیام کا ذریعہ نہیں بنتے وہ بے روح رسموں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔

☆☆☆

سلیم! ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر سمجھ لو کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ اعمال اسلامی کا ماحصل محض اسی دنیا کی فلاح و کامیابی' غلبہ و تسلط ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کی بادشاہت اور فرعون کی حکومت میں فرق کیا ہوا؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعمال اسلامی کا لازمی اور فطری نتیجہ اس دنیا میں حکومت و سطوت اور شوکت و عظمت کی زندگی بھی ہے اور اس کے بعد کی دنیا میں سرخروئی اور آبرومندی کی زندگی بھی۔ اگر ہمارے اعمال اس دنیا میں شوکت و عظمت پیدا نہیں کرتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے اعمال اسلام کی میزان میں پورے نہیں اترتے۔

☆☆☆

سلیم! تم پوچھتے ہو کہ بالآخر یہ عذاب کی زندگی ہم پر مسلط کیوں ہو گئی۔ حیران ہوں کہ تم اب تک اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکے۔ اس سے تم متفق ہو گے کہ قرآن کا مقصد لوگوں کو تمام خود ساختہ سلاسل و اغلال سے آزاد کر کے ان سے صرف قانون خداوندی کی اطاعت کرانا تھا۔ لیکن سلیم! تم ذرا اپنی تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھو کہ جس انسانی استبداد کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا' کن کن شاہراہوں سے وہی استبداد امت پر مسلط کیا گیا۔ اور قیامت یہ کہ اس استبداد کا تسلط بیشتر مذہب کی آڑ میں ہوا اور ہر وہ طوق جسے اتار پھینکنے کے لئے قرآن آیا تھا اسے عین اسلامی بنا کر مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ تم سمجھتے ہو کہ خدا کی میزان میں یہ جرم کچھ ایسا کم وزنی تھا کہ یونہی معاف کر دیا جاتا؟ امم گذشتہ جن جرائم کی پاداش میں

ذلت و مسکنت کے عذاب میں گرفتار ہوئی تھیں' کیا وہ اسی قسم کے جرائم نہ تھے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ فطرت کسی کی سوتیلی ماں ہے کہ وہ ایک بچے کے ساتھ ایک قسم کا اور دوسرے کے ساتھ دوسری قسم کا سلوک کرے گی۔ اس کے قانون اٹل ہیں اور ان کا ہر ایک پر یکساں طور سے اطلاق ہوتا ہے۔ پہلوں نے یہی کچھ کیا تو ان پر عذاب آیا۔ جب مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا تو ان پر عذاب کیوں نہ آتا؟ ان پر تو بلکہ اور بھی زیادہ سختی سے عذاب آنا چاہئے تھا کہ ان کے پاس قانون خداوندی کا ضابطہ اپنی اصلی اور مکمل شکل میں راہ نمائی کے لئے موجود تھا' لیکن انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا۔ کیا اس کی سزا اس سے کچھ مختلف ہونی چاہئے؟ انہیں وراثت کتاب کے لئے منتخب کیا گیا۔ نوع انسان کے لئے بہترین امت قرار دیا گیا۔ لیکن سب ایمان و عمل کے بدلے میں' نہ صرف نام رکھوانے کے عوض۔ اس کے باوجود تم پوچھتے ہو کہ اس قوم پر خدا کا عذاب کیوں مسلط ہوا؟ سلیم! اخوت' مساوات' حریت' وحدت انسانی' جماعتی زندگی' مرکزیت' اطاعت' فرد کا ملت کے لئے سب کچھ کرنا اور ملت کا افراد کی ربوبیت کا سامان فراہم کرنا۔ یہ تھیں نظام حقیقی کی خصوصیات۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اس منشاء الٰہی کو کب سے بھولے ہوئے ہیں۔ چھوڑ دو ابتدائی دور ہمایوں کے مختصر سے زمانے کو اور اس کے بعد قرآن کریم کی کسوٹی سے پرکھتے جاؤ امت مسلمہ کے ایک ایک عمل کو۔ حقیقت تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائے گی۔

لیکن بایں ہمہ' عزیزم! ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ جس قرآن کی رو سے ایک مرتبہ وہ نظام قائم ہوا تھا وہی قرآن آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر آج بھی مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں تو پھر دیکھو ان کی نمازیں اور ان کے روزے کس طرح وہی نتائج پیدا کرتے ہیں جن کے دیکھنے کے تم اور ہر دردمند مسلمان متمنی ہے۔ **وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ** ﴿۷/۹۶﴾

''اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے قوانین خداوندی کی صداقت کو جھٹلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے قانون مکافات نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑ لیا۔'' اس ایمان و تقویٰ کی حقیقت تمہیں قرآن کریم سے ملے گی' بشرطیکہ تم اسے' تمام غیر قرآنی تصورات کو ذہن سے نکال کر سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس لئے کہ ؎

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

(اقبال)

والسلام (نومبر ۱۹۳۹ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق

ارسطو کا نظریہ وسط زرین کے مطابق انسانِ کامل کا تصور

تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ بہت ہی کم عرصے یعنی نہ ہونے کے برابر حصہ میں دنیا میں مثالی معاشرے کے قیام اور وہ بھی نامکمل حالت میں ملتا ہے۔ عام طور پر ہم مثالی معاشرے کی اقدار کے خلاف مبنی معاشرے میں ہی زندگی گزار رہے ہیں جہاں خواہشات کا راج ہوتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک ارادہ کی غایت یا مقصد ہمیشہ ہماری خواہشات اور پسند و ناپسند سے متعین ہوتا ہے۔ لہٰذا عقل کا کام غایتوں کی بجائے صرف خواہشات کی تکمیل کے لیے ذرائع کا معین اور فراہم کرنا ہے اور اس کے لیے اس کا وسط زرین کا اصول فراہم کیا جائے۔

ارسطو کا نظریہ خیر وسط زریں کی صورت میں

ارسطو نے اپنی کتاب میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ:

> بعض اوقات انسان کو علم حاصل تو ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود جذبات و خواہشات کی شدت سے مغلوب ہو کر ایسے فعل کا مرتکب ہو جاتا ہے جس کی عقل اجازت نہیں دیتی، اگر عقل اور علم کے باوجود انسان گمراہی کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ تو وہ ان اصولوں پر معاشرہ بھی تشکیل دے سکتا ہے۔ ان حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کس طرح خیر کا راستہ اپنا سکتا ہے؟ ارسطو کا جواب یہ ہے مسلسل مشق اور اعادہ سے بہتر اخلاق زندگی پیدا کی جا سکتی ہے' انسان کو چاہیے کہ چاہے انفرادی طور پر لیکن اس کوشش میں ہمیشہ مصروف رہے کہ جذبات و خواہشات پر عقل کی حکمرانی قائم کی جائے، مسلسل مشق سے سرکش جذبات کو عقل کے تابع فرمان کیا جا سکتا ہے اس طرح حیوانی تقاضوں کو عقلی تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کی عادت بن جاتی ہے۔ (Ethica Nicomachea)

ارسطو کے نزدیک نہ ہی ایک ایسی راہبانہ طرز زندگی جائز ہے جس میں حیوانی تقاضوں کی مکمل نفی کر دی جائے اور

نہ ہی ایک ایسی زندگی قابل تحسین ہے جس میں حیوانی جذبات کا محاسبہ کرنے سے عقل مفلوج ہوکر رہ جائے۔ نیکی اور فضیلت روح کے معقول اور غیر معقول حصوں میں توازن اور اعتدال کا نام ہے، افلاطون نے بھی یہی کہا تھا کہ جب عقل، جذبہ اور شہوت میں توازن پیدا ہو جائے تو زندگی میں سعادت اور نیکی پیدا ہوسکتی ہے۔(Ethica Nicomachea)

ارسطو نے اس نظریہ اعتدال کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

ہر نیکی دو بدیوں کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ ہر معاملہ میں افراط بھی ہوتی ہے اور تفریط بھی۔ اس وسط زریں کا تعین کسی لگے بندھے قاعدے، کلیہ سے نہیں ہوتا۔ ہر شخص کے لیے وسط زریں مختلف حالتوں میں مختلف جگہوں پر واقع ہوگا اور اسے حاصل کرنے کے لیے نیکی کی عادت کو سیرت کا جزو بنانا ہوتا ہے جو علم کی افزونی سے نہیں بلکہ جذبات کے مسلسل تصرف اور ضبط نفس کی مشق سے پیدا ہوتی ہے۔

اپنے نظریہ اعتدال کی تشریح و توضیح کے لیے ارسطو نے مثالیں دے کر وسط زریں کی وضاحت کر کے خیر کی وضاحت کی ہے، جسے وہ توازن کا نام بھی دیتا ہے۔

افراط	وسط (خیر)	تفریط
تہور	شجاعت	بزدلی
شہوت پرستی	عصمت	بے حسی
اسراف	سخاوت	بخل
غرور	خودداری	عجز
شرمیلا پن	حیا	بے شرمی
بے صبرا پن	صبر و تحمل	ناسمجھی
حقارت	عزت و احترام	کبر و نخوت
بے اعتنائی	شرافت نفس	تنک مزاجی
اکھڑ پن و ناشائستگی	لطف و عنایت و یگانگت	خوشامد اور چاپلوسی
گنوار پن	بذلہ سنجی	ابلہ پن

قدامت پسندی روشن خیالی آزاد خیالی

ارسطو کے ہاں البتہ اس وسط میں شمار کرنے کے لیے کسی معیاری ضابطے کو سامنے نہیں لایا گیا۔

قدیم یونانی حکماء جمال اور خیر میں کوئی تمیز نہ کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ خود جمال پرست تھے اور ہر شے میں تناسب اور حسن دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی اصول کی بنیاد پر ارسطو نے وسط زریں کا تصور دیا۔ وہ خیر کو بھی حسن بمعنی توازن ہی کی خصوصیت کے طور پر سامنے لایا ہے۔

عملی دنیا میں دیکھا گیا ہے کہ ہر خیر کا حامل فعل حسین ہونے کی خود بخود صلاحیت نہیں رکھتا۔ بعض خیر کے حامل افعال حسین کہے جاسکتے ہیں لیکن ہر ایسے عمل کے لیے ضروری نہیں کہ حسین بھی ہو۔

اپنے اس وسط زرین کے اصولوں پر وہ انسان کامل کا تصور سامنے لاتا ہے جس کی خصوصیات اسے مسرت سے ہمکنار کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

ارسطو کا انسان کامل

ارسطو نے اپنے نظریہ پر مبنی معیاری انسان کی ممتاز صفات کا ذکر یوں کیا ہے: (Ethica Nicomachea)

۱۔ وہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ خطروں میں نہیں ڈالتا۔ کیونکہ بہت کم چیزیں ایسی ہیں جن کی وہ اس قدر پروا کرتا ہو کہ ان کی خاطر خطرہ مول لے۔ لیکن نارک آزمائشوں میں وہ اس بات پر رضا مند ہوتا ہے کہ اپنی جان قربان کر دے۔

۲۔ وہ دوسروں کے کام آتا ہے لیکن خود دوسروں کا احسان لیتے ہوئے اسے ننگ و عار محسوس ہوتی ہے۔

۳۔ اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا کھلم کھلا اظہار کرتا ہے۔ صاف بات کرتا ہے اور اعمال بھی باتوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ اپنے جذبات کو چھپانا اور حق گوئی سے باز رہنا بزدلی سمجھتا ہے۔

۴۔ دوستی کے مراسم سے قطع نظر وہ دوسروں کے ماتحت زندگی بسر نہیں کرسکتا کہ یہ غلام کی صفت ہے۔

۵۔ بغض سے وہ مبرا ہوتا ہے جو لوگ اسے نقصان پہنچاتے ہیں وہ ان سے انتقام نہیں لیتا بلکہ اپنے دکھ کو بھی بھول جاتا ہے۔

۶۔ وہ باتونی نہیں۔ اسے اپنی تعریف کا شوق نہیں نہ دوسروں کی مذمت کی خواہش۔ وہ لوگوں کو برا بھلا نہیں کہتا۔ دشمنوں کی مخالفت کرنا مقصود ہوتی ہے تو منہ پر کرتا ہے۔

۷۔ اس کی چال باوقار ہوتی ہے۔اس کی آواز گھمبیر،اس کے بول نپے تلے۔ وہ عجلت نہیں کرتا۔کیونکہ بہت تھوڑی چیزیں اسے متاثر کرتی ہیں وہ جوش میں نہیں آتا کیونکہ اس کے خیال میں کوئی ایسی چیز اتنی اہم نہیں کہ آدمی کو جوش دلا سکے۔

۸۔ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں وہ انہیں وقار شان اور سلیقے سے برداشت کرتا ہے جیسے بھی حالات ہیں ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

۹۔ وہ اپنا بہترین دوست ہوتا ہے اور تنہائی میں خوش رہتا ہے۔درآنحالیکہ جس شخص میں کوئی فضیلت یا استعداد نہ ہو، وہ اپنا بدترین دشمن ہوتا ہے اور تنہائی سے ڈرتا ہے۔

۱۰۔ وہ خوددار ہوتا ہے۔

۱۱۔ وہ اپنی خوبیوں کو کم ترین سمجھتا ہے۔

۱۲۔ جو نفرت کا مستحق ہے اس سے نفرت کرتا ہے۔

۱۳۔ انتہائی درجہ کا فیاض ہے اور اس وجہ سے سب سے زیادہ عزت اور ذلت کا خیال رکھتا ہے۔

۱۴۔ وہ کسی کے عمل کے جواب میں بھی اسے اس کے عمل سے بھی زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے۔

۱۵۔ وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتا اور اگر مانگنے کی ضرورت پڑے تو بہت احتیاط کرتا ہے لیکن دوسروں کو کچھ دینے کے لیے ہمیشہ تیار و آمادہ رہتا ہے۔

۱۶۔ وہ کھل کر آزادی سے بات کرتا ہے کیونکہ اسے جھوٹ سے نفرت ہے۔

۱۷۔ وہ سچ بولنے کا قائل ہے سوائے اس کے کہ جب بے ہودہ لوگوں کے ساتھ طنزیہ انداز میں بات کر رہا ہو۔

۱۸۔ وہ کسی کی مبالغہ آمیز تعریف نہیں کرتا کیونکہ اس کی نگاہ میں بہت ہی کم چیزوں کو عظیم سمجھتا جا سکتا ہے۔

۱۹۔ یا وہ گوئی سے پرہیز کرتا ہے کیونکہ وہ نہ تو اپنے متعلق کوئی بات کرتا ہے اور نہ ہی دوسروں کے متعلق۔

۲۰۔ اسے کسی سے نہ تو اپنی تعریف و توصیف کی تمنا ہے اور نہ کسی کی الزام تراشی کی پروا۔

ارسطو کا انسان کامل (فیاض) انسان اس طرح کا ہوتا ہے کیونکہ اس سے کم تر شخص غیر ضروری انکسار والا اور اس سے بڑھ کر ہونا مغرور ہونا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

طلوع اسلام کا مقصد

جوں جوں ملک میں قرآنی فکر عام ہورہی ہے، طلوع اسلام کے خلاف پروپیگنڈا بھی تیزی سے بڑھایا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض طبقوں میں اس کی شدت اشتعال تک پہنچادی جاتی ہے۔ ہمیں اس پر کبھی اعتراض نہیں ہوا کہ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں اس سے اختلاف کیوں کیا جاتا ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ خدا کی طرف سے وحی ہے جس سے کسی کو اختلاف کا حق حاصل نہیں۔ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں وہ قرآن کریم کی تعلیم کو سمجھنے کی انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں سہو بھی ہوسکتا ہے اور خطا بھی۔ جو شخص ہمیں ہماری کسی غلطی پر متنبہ کرتا ہے، ہم اس کے شکر گزار ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی بات کی تائید میں قرآن کریم کی سند رکھتا ہو۔ لیکن ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کی کیفیت جدا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ طلوع اسلام کہتا ہے اسے اس کے الفاظ میں اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کر کے اس پر قرآن کریم کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں اور اسے طلوع اسلام کی طرف منسوب کر کے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ چونکہ ہماری قوم بھی عام طور پر سہل انگار واقع ہوئی ہے اس لئے کوئی اس بات کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جو کچھ طلوع اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس نے کہا بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے ان مخالفین کا حربہ کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کہ جو لوگ دیانتداری سے تحقیق کرنا چاہیں، ان پر حقیقت واضح ہوجائے، ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم مختصر الفاظ میں اس مقصد کو درج کرتے ہیں:

ہمارا مقصد یہ ہے کہ.....

۱۔ تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

۲۔ خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

۳۔ قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کی حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

۴۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

۵۔ دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

۷۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

۸۔ بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

۹۔ ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلندترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

۱۰۔ چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجود ثنویت ختم ہوجائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہوجائیں گے۔

۱۱۔ جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوجاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردوبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

۱۲۔ قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

۱۳۔ قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کرسکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

۱۴۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

۱۵۔ ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

۱۶۔ طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا

ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

☆☆☆

جو حضرات طلوع اسلام کے اس مقصد سے متفق ہیں وہ مقامی طور پر اس فکر کے عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی اس تنظیمی کوشش کا نام ہے ''بزم طلوع اسلام''۔ جو لوگ اس بزم کے ممبر بنتے ہیں ان سے نہ کوئی نیا عقیدہ منوایا جاتا ہے، نہ احکام خداوندی کے علاوہ کسی اور کی اطاعت طلب کی جاتی ہے، نہ وہ کوئی الگ پارٹی بناتے ہیں، نہ عملی سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں، نہ وہ کسی کو اپنا پیر و مرشد سمجھتے ہیں نہ امیر و مطاع۔ یہ ان **متفق الخیال** احباب کی تنظیم ہوتی ہے جو یک نگہی و یک جہتی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی کوشش کرتے ہیں، اس کے سوا ان کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا اور یہ جو کچھ کرتے ہیں اس میں نہ کوئی راز ہوتا ہے نہ پردہ، نہ ہی کسی قسم کی جلب منفعت۔

المختصر: مسلمانوں کے قلب و دماغ سے ہر قسم کے غیر قرآنی تصورات و نظریات اور معتقدات نکال کر ان کی جگہ خالص قرآنی تصورات پیش کرنا اور دلائل و براہین کی رو سے پیش کرنا طلوع اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔ اسمیں وہ، قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو سب سے پہلے اپنے سامنے رکھتا ہے تاکہ وہ مغربی سیکولرازم اور اشتراکیت کے سیلاب سے بچ کر پاکستان میں صحیح قرآنی معاشرہ قائم کرنے کے قابل ہوسکیں۔

☆☆☆

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا۔۔۔؟

۱۔ قرآنی معاشرہ میں ہر شخص کی عزت بلاتمیز قوم، رنگ، نسل، پیشہ، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص اپنے فرائض کی بجاآوری میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے اور نوع انسان کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے۔

۲۔ کوئی شخص بے کس و لاچار اور بے یار و مددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی، اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔ کوئی صاحب اثر انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا۔

۳۔ کوئی فرد بھوکا ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔ یعنی قرآنی معاشرہ ہر شخص کی اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔

۴۔ معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا انتظام کرے جس سے انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ بالفاظ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

۵۔ ہر شخص اپنی پوری استعداد و محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کریں گے، جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہوگئے ہوں، یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہوجائیں اور باقی لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

۶۔ ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی اپنے دل کی رضامندی سے حاجت مندوں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھے گا بلکہ عندالضرورت دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے گا۔ ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔

۷۔ رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ افراد معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ جب افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجت مندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

۸۔ ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق (اس معاشرہ میں گروہوں' لیڈروں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا۔) اس لئے اس میں نہ کسی قسم کا جور ہوگا نہ استبداد' نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔ اسے نظام خداوندی یا قرآنی نظام معاشرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۹۔ ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ ہوگا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

۱۰۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوگا کہ ہر شخص قوانین خداوندی کے محکم اور مکافات عمل کے برحق ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ نظام قائم ہی ان بنیادوں پر ہوگا۔ اس میں قرآن کریم کی مستقل اقدار عملاً نافذ ہوں گی۔

تحریک طلوع اسلام' پاکستان میں اس قسم کے نظام کی تشکیل کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ نوع انسان کی مشکلات اور مصیبتوں کا حل اسی قسم کے نظام کے قیام میں مضمر ہے تو اس کے قیام و عمل کے لئے اپنا فریضہ ادا کیجئے اور ہم سے تعاون فرماتے ہوئے ادارہ یا قریبی بزم سے رابطہ کیجئے۔

چیئرمین ادارہ آپ سے اپیل کرتا ہے کہ اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں اور ان کو بروئے کار لانے میں اپنے آپ کو آمادہ پاتے ہیں اور مدد کرنا چاہتے ہیں تو اپنے مختصر کوائف قریبی بزم یا ادارہ کو بھجوا دیں۔ آپ حضرات بحدِ استطاعت ان مقاصد کی معاونت کر سکتے ہیں لیکن آپ پر ادارہ کے قواعد و ضوابط کی پابندی اور وابستگی لازمی نہیں ہوگی۔

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام' ۲۵۔ بی' گلبرگ ۲' لاہور

☆☆☆☆☆

پاکستان میں

غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ

کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل منظور شدہ مقامات پر ہوتا ہے

نوٹ: نمائندگان محترم سے التماس ہے کہ ایڈریس یا اوقاتِ درس میں تبدیلی کی صورت میں ادارہ کو فی الفور مطلع فرمائیں۔

شہر	مقام	دن	وقت
ایبٹ آباد	234-KL کیہال۔ رابطہ۔ گل بہار صاحبہ	بروز جمعہ	10AM
ایبٹ آباد	234-KL کیہال۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین، فون۔334699، موبائل 0321-9813250	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
اسلام آباد	برمکان ڈاکٹر انعام الحق، مکان نمبر 302، سٹریٹ نمبر 57، F-11/4۔ رابطہ: ڈاکٹر انعام الحق، فون نمبر 2107321۔	ہر اتوار	11AM
اوکاڑہ	برمکان احمد علی، ابوبکر بلاک، گلی 4، نزد مبارک مسجد، شادمان کالونی، جناح روڈ، رابطہ میاں احمد علی: 0442-527325	جمعۃ المبارک	3PM
پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	3PM
جہلم	جنجوعہ ٹاؤن، پوسٹ آفس فوجی ملز، نزد بیکن ہاؤس سکول۔	ہر ماہ کی پہلی اور آخری اتوار	4PM
جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	ہفتہ	5AM
چوٹی زیریں	بردوکان لغاری برادرز زرعی سروس، ڈیرہ غازی خان۔ رابطہ: ارشاد احمد لغاری۔	ہر ماہ پہلا اتوار	12 بجے دن
چنیوٹ	11/9-W، گوجر چوک (گنبد والی کوٹھی) سیٹلائیٹ ٹاؤن۔ رابطہ: آفتاب عروج، فون: 047-6331440-6334433۔	ہر جمعہ	بعد نماز جمعہ
حیدرآباد (قاسم آباد)	محترم ایاز حسین انصاری، B-12، حیدرآباد ٹاؤن، فیز نمبر 2، قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر آخری بس سٹاپ۔ رابطہ فون 654906	جمعۃ المبارک	بعد نماز عصر
راولپنڈی	فرسٹ فلور، کمرہ نمبر 114، فیضان پلازہ۔ کمیٹی چوک رابطہ فون: 5542985-5774752	جمعۃ المبارک اتوار	4PM 4PM
خان پور	بمقام مکان حبیب الرحمان، محلہ نظام آباد، وارڈ نمبر 9 خان پور، ضلع رحیم یار خان رابطہ: نمائندہ حبیب الرحمٰن۔ فون نمبر گھر: 5575696، دفتر: 5577839۔	ہر جمعہ	3PM

سیالکوٹ	معرفت کمپیوٹرسٹی‘ سٹی ہاؤس‘ سٹی سٹریٹ‘ شہاب پورہ روڈ‘	ہر دوسرے اتوار	5PM
رابطہ: محمد حنیف‘ 03007158446۔ محمد طاہر بٹ‘ 0300-8611410۔ محمد آصف مغل 0333-8616286۔ سٹی ہاؤس 052-3256700			
سرگودھا	B-4‘ گلی نمبر 7‘ بلاک 21‘ نزد مکی مسجد چاندنی چوک	منگل	7PM
	رابطہ۔ ملک محمد اقبال۔ فون: 711233		
فیصل آباد	رحمان نور سینٹر‘ فرسٹ فلور‘ مین ڈگلس پورہ بازار‘	ہر جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
	رابطہ: محمد عقیل حیدر‘ موبائل: 0300-6609855		
فتح پور‘ سوات	فتح پور‘ سوات‘ رابطہ: خورشید انور‘ فون: 840055	ہر اتوار	3PM
کراچی	105 سی بریز پلازہ‘ شاہراہ فیصل	اتوار	10AM
کراچی	A-446 کوہِ نور سنٹر‘ عبداللہ ہارون روڈ‘ رابطہ محمد اقبال۔ فون: 5892083	ہر اتوار	10AM
کراچی	ڈبل اسٹوری نمبر ۱۶‘ گلشن مارکیٹ‘ کورنگی نمبر ۵۔	ہر اتوار	2PM
	رابطہ: محمد سرور۔ فون نمبرز: 5046409-5031379‘ موبائل: 0321-2272149		
کراچی	نالج اینڈ وزڈم سنٹر‘ ڈی۔۲‘ گراؤنڈ فلور‘ ڈیفنس ویو‘ نزد اقراء یونیورسٹی	بروز ہفتہ	3PM
	رابطہ: آصف جلیل۔ فون: 5801701‘ موبائل: 0333-2121992۔ محمود الحسن۔ فون: 5407331۔		
کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ۔ رابطہ فون: 825736	اتوار	4PM
گوجرانوالہ	شوکت نرسری‘ گل روڈ‘ سول لائنز‘ رابطہ فون نمبر: 736140	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
لاہور	B-25‘ گلبرگ 2‘ (نزد مین مارکیٹ‘ مسجد روڈ)	ہر اتوار	9:30AM
لاڑکانہ	برمکان اللہ بخش شیخ نزد قاسمیہ محلّہ جاڑل شاہ‘ رابطہ فون: 42714	ہر جمعہ	بعد نماز مغرب
ملتان	شاہ سنز پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ‘ وہاڑی روڈ‘ (بس سٹینڈ چوک سے تقریباً اڑھائی کلومیٹر وہاڑی کی طرف)‘ ملتان۔	جمعۃ المبارک	3:30PM سے
منڈی۔۔ بہاؤالدین	رابطہ: خان محمد‘ (وڈیو کیسٹ) برمکان ماسٹر خان محمد گلی نمبر 1‘ محلّہ صوفی پورہ۔	ہر جمعہ	10 AM
نواں کلی‘ صوابی	رابطہ بابو اسرار اللہ خان‘ معرفت ہومیو ڈاکٹر ایم۔ فاروق‘ محلّہ خدر خیل	اتوار	10 AM
صوابی	بمقام چار باغ‘ (حجرہ ریاض الامین صاحب)‘ (رابطہ: انچارج یوٹیلیٹی سٹورز‘ مردان روڈ‘ صوابی)	ہر اتوار	3 P.M
	فون نمبرز: (0938)310262, 250102, 250092		

غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی انہی جگہوں پر دستیاب ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

مسلمانوں کی تاریخ ماخوذ قرآن الکریم

☆ اسلام کے صدرِ اول میں مسلمانوں کی زندگی ایسی قابلِ رشک تھی کہ کفار حسرت سے کہتے کہ کاش! ہم بھی مسلمان ہوتے (۲/۱۵)۔ کیونکہ وہ مسلمان! فی الحقیقت ''مومن'' تھے (۸/۷۴)۔

☆ انہیں امتِ وسطیٰ (ایسی قوم جسے دنیا میں مرکزی حیثیت حاصل ہو) بنایا گیا تھا۔ ان کے لئے نظام یہ تھا کہ یہ اقوامِ عالم کی نگرانی کریں اور ان کے اعمال کی نگرانی ان کا رسول ﷺ (مرکزِ نظامِ خداوندی) کرے۔ جب تک یہ نظام قائم رہا انہیں وہ پوزیشن حاصل رہی۔ جب وہ بگڑ گیا ان کا وہ مقام بھی ان سے چھن گیا (۲/۱۴۳)۔

☆ انہیں ایسا ضابطہ زندگی دیا گیا تھا جو شجرِ طیب کی طرح ہمیشہ ثمر بار رہنے والا ہے۔ اس کے ذریعے انہیں دنیا میں ثبات و استحکام نصیب ہوا تھا۔ لیکن ان کے لیڈر ان کے قافلے کو ایسی منڈی میں لے گئے جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہیں یعنی جہنم میں (۱۴/۲۴۔۲۸)۔

☆ مسلمانوں نے اسلام کا صحیح نظام اختیار کرنے کے بعد پھر کفر کا باطل نظام اختیار کر لیا حالانکہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا تھا کہ ان کا رسول ﷺ کتنی بڑی حقیقت کا حامل تھا۔ اور خدا کے قوانین ان کے سامنے واضح طور پر آ چکے تھے۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قوانینِ خداوندی کی برکات، فطرت کی قوتوں کے مفاد اور انسانی جماعتوں کے تعاون سے محروم رہ گئے۔ لیکن اگر یہ اب بھی اس روش کو چھوڑ کر صحیح نظام اختیار کر لیں تو انہیں وہی مقام مل سکتا ہے۔ (۳/۸۵۔۸۸)۔

☆ نظامِ خداوندی کی تائید و نصرت سے انہیں غلبہ حاصل ہوا تھا اسے چھوڑ دیا تو ذلیل و خوار ہو گئے (۳/۱۵۹)۔ خدا کا اعلان ہے کہ وہ مومنین پر کفار کو کبھی غلبہ نہیں دے گا (۴/۱۴۱)۔ لہٰذا یہ اصول ایک اٹل معیار ہے اس بات کے پرکھنے کا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان مومن ہیں یا نہیں۔ (ہر مومن مسلمان ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مسلمان مومن ہو۔ اس دنیا میں جنتی معاشرہ یا اخروی دنیا کی جنت مومنین، متقین کے لئے مختص ہے۔ غیر اللہ کی اطاعت و محکومیت اور فرقہ پرستی شرک ہے اور شرک سے جنت حرام ہو جاتی ہے (۵/۷۲)۔

☆ دین میں فرقے پیدا کر لینے اور باہمی جنگ و جدال میں الجھ جانے سے ان پر تباہی آ گئی (۶/۶۵)۔ فرقوں میں بٹی ہوئی قوم کا رسول ﷺ سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ (۶/۱۶۰) جب رسول سے واسطہ نہ رہا تو اللہ کی نصرت بھی گئی۔

☆ اللہ نے انہیں اختلافات اور فرقہ بندی سے منع کیا تھا کیونکہ یہ بڑا سنگین جرم ہے اس لئے اس کی سزا بھی بڑی سخت ہے۔ مسلمانوں نے فرقوں میں بٹ کر خدا کی معصیت اختیار کی تو ذلیل و خوار اور تباہ ہو گئے (۳/۱۰۴)۔

☆ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری، انسانوں کی غلامی و محکومی کی زنجیروں سے آزاد کروایا تھا (۷/۱۵۷)۔ (انہوں نے اندھی تقلید کی عقیدت سے ان زنجیروں کو پھر سے پہن لیا)۔

☆ اللہ کی طرف سے ضابطہ حیات اس لئے دیا گیا تھا کہ اسے لوگوں کے سامنے کھول کر رکھ دیا جائے لیکن جب اسے پسِ پشت ڈال دیا گیا اور مذہبی پیشوائیت نے دین کو ذریعہ معاش بنا لیا تو قوم پر تباہی آ گئی (۳/۱۸۶)۔

☆ سورہ توبہ کی آیت ۳۴ میں انہیں، دین کی راہ میں روک بن کر باطل طریق سے دوسروں کا مال کھانے والے احبار و رہبان سے آگاہ کیا گیا۔ انہوں نے ترمذی کی حدیث کے مطابق اپنے علماء و مشائخ (دنیا کو قابل نفرت قرار دینے والے اہل تصوف) کو خدا بنا لیا تو ان پر زوال کا عذاب چھا گیا۔ غیر مسلم اقوام اشیائے کائنات کی تسخیر سے آگے نکل گئیں اور ان کی گاڑی پیچھے رہ گئی، خدا کا قول سچ ثابت ہوا کہ ویل لکل افاك اثیم (الجاثیہ)۔

☆ انہوں نے عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دیا تو جہنم کی تباہیوں میں گھر گئے (۷/۱۷۹)۔ عذاب کی علامت یہ ہے کہ (گداگروں کی طرح) دنیاوی زندگی دکھ درد سے بھری ہو اور ان کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہو (۹/۷۴)۔

☆ اللہ نے انہیں واضح قوانین دیئے۔ یہ ان سے اس طرح نکل گئے جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اس کا نشان تک اس کے جسم پر باقی نہیں رہتا۔ خدا چاہتا تھا کہ انہیں قرآن کے اتباع سے شرفِ انسانیت کی بلندیوں تک پہنچا دیا جائے۔ یہ اپنے پست جذبات کے اتباع سے زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گئے (۷/۱۷۵۔۱۷۸)۔

☆ انہیں حکومت دی گئی تھی تاکہ دیکھا جائے کہ یہ کس قسم کے کام کرتے ہیں۔ جب تک یہ صحیح روش پر چلتے رہے انہیں قوت و ثروت حاصل رہی۔ جب غلط راستے پر چل نکلے تو وہ سب کچھ چھن گیا (۶/۱۶۶)۔

☆ مسلمانوں کو ان لوگوں کے ملکوں میں آباد کیا جنہوں نے ظلم اور زیادتی کی تھی (جب انہوں نے ظلم اور زیادتی شروع کر دی تو ان کے ملکوں پر دوسری قومیں مسلط ہو گئیں (۴/۴۵۔۴۷)۔ قرآن کا اعلان ہے کہ اگر تم اس نظام سے پھر جاؤ گے تو خدا تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا (۴۷/۳۸)۔

☆ انہوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے سکول، ہسپتال اور دیگر رفاہی ادارے تعمیر کرنے کے بجائے درسِ نظامی کے لئے مدرسے اور فرقہ پرستی کی گرہیں پکی کرنے کے لئے بڑی بڑی عالیشان مسجدیں تعمیر کر کے عوام کی دولت صرف کر دی۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لئے اگر مسجد بھی تعمیر کی جائے تو وہ جہنم میں لے جاتی ہے۔ (چہ جائیکہ مسجدیں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے پہچاننے کی علامات بن جائیں (سورہ توبہ)۔

☆ قرآن کریم میں ہے کہ مومن اور فاسق برابر نہیں ہو سکتے اور یہ بھی اللہ کا فرمان ہے کہ جو لوگ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے قوانین خداوندی کو پسِ پشت ڈال دیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ان کی اپنی ذات ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور وہ فاسقون ہو گئے (۵۹/۱۹)۔ اللہ کے اس واضح حکم کے برعکس مسلمانوں نے غیر اللہ کی اطاعت و محکومیت اختیار کر لی تو فاسقین بن کر تباہیوں کے جہنم میں جا گرے۔ موجودہ روش پر چلتے ہوئے ہزار چاہیں کہ اس سے نکل جائیں، انہیں اپنے اعمال کا مزہ چکھنے کے لئے پیچھے دھکیل دیا جاتا رہے گا (۲۱۔۲۰/۳۲)۔

☆ جس طرح خارجی کائنات میں خدا کا نظام چل رہا ہے اسی طرح انسانی دنیا میں اپنا نظام چلانے کے لئے اس نے ایک جماعت منتخب کر لی۔ یہ جماعت اپنی زندگی کے ہر شعبے میں قرآن کا اتباع کرتی تھی اس لئے خدا نے اسے بہترین امت قرار دیا تھا (۳/۱۰۹)۔ لیکن جب بعد میں آنے والوں کے قلب و نگاہ میں تبدیلی آ گئی تو یہ اپنے مقام بلند سے نیچے گر گئے (۸/۵۳)۔ (۱۳/۱۱)۔ اور ان کا شمار مردہ اقوام میں ہو گیا۔ زندہ قوموں کے مقابلہ میں مردہ قوموں کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو انسان کے مقابلہ میں حیوانات کی۔ حیوانات کی زندگی کا اپنا مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مالک کی خدمت گزاری کے لئے جیتے ہیں اور اسی کی خاطر مرتے ہیں۔ وہ اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ (۷۱/۳۶)۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں۔ قانون خداوندی کی رو سے بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے (۸/۲۲)۔

☆ خدا کو چھوڑ کر اپنے سرکش جذبات کے پیچھے لگ کر بزعمِ خویش سمجھتے یہی ہیں کہ یہ بالکل سیدھے راستے پر چل رہے ہیں (۳۰/۷)۔ یہی ہٹ دھرمی دین (قرآنی نظام) کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

☆ نظامِ الصلوٰۃ کے ضائع کر دینے سے ان پر تباہی آ گئی۔ اگر یہ پھر اسے قائم کر لیں تو پھر وہی جنتی معاشرہ انہیں مل جائے گا (نظامِ الصلوٰۃ سے مراد ہے قرآن کے مطابق معاشرہ اور نظام کی تشکیل (۶۱۔۵۹/۱۹)۔

☆ مومنین کی نصرت خدا کے ذمے فرض ہے (۴۷/۳۰) اور مومنین کو غیر مساعد حالات سے نجات دلانا بھی۔ لہٰذا اگر

مسلمان غیر مساعد حالات سے باہر نہیں نکل سکتے تو بات واضح ہے کہ یہ مومن نہیں رہے (۱۰/۱۰۳)۔

☆ اللہ کا ارشاد ہے کہ اکثر لوگ ایمان کے دعوے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں (۱۲/۱۰۶)۔ خدا اپنی حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا (۱۸/۲۶)۔ خدا کا حکم ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرنا (۱۸/۱۱۰)۔ مسلمانوں نے خدا کے اس حکم کی نافرمانی کر کے غیر خدائی قوتوں کی اطاعت اختیار کر لی تو ان پر اس دنیا میں ذلت و رسوائی کا عذاب آ گیا اور یومِ قیامت کا عذاب اس سے بھی شدید ہوگا (۲/۸۵)۔

☆ اللہ التواب الرحیم کی رافت ہے کہ اس نے فرمایا:

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعاً إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ○ وَأَنِيبُوا إِلَى رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ○ وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ○ (۵۵۔۵۳/۳۹)۔

جو لوگ ہمارے قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہیں ان سے کہہ دو کہ ان کے لئے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ان کے جو حالات ہمارے قانون کے خلاف چلنے سے بگڑ گئے ہیں، وہ ہمارے قانون کے مطابق چلنے سے، پھر سے سنور سکتے ہیں۔ یہ قانون ایسا ہے کہ اس کے اتباع سے سابقہ لغزشوں کے پیدا شدہ نقصانات کی تلافی بھی ہو جاتی ہے اور مزید نشوونما کا سامان بھی مل جاتا ہے۔ اس سے تخریبی عناصر سے حفاظت اور تعمیرِ خویش کے مواقع دونوں حاصل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا تم اس کے قانون کی طرف رجوع کرو اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو۔ لیکن اس میں دیر مت کرو۔ اس لئے کہ جب یہ مہلت کا وقفہ ختم ہو گیا اور ظہورِ نتائج کا وقت آ گیا تو پھر تمہیں اس تباہی سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ لہٰذا قبل اس کے کہ آنے والی تباہی دفعتہً تمہارے سامنے نمودار ہو جائے درآنحالیکہ تمہیں اس کی خبر تک نہ ہو اس ضابطہ خداوندی کا اتباع کرو۔ اس طرح کہ جو معاملہ سامنے آئے، اس کے لئے دیکھو کہ اس پر اس کے کونسے حکم کا ٹھیک ٹھیک اطلاق ہوتا ہے اس کے مطابق عمل کرو۔ لیکن اس سے پہلے طاغوت کے اتباع و اطاعت کو چھوڑنا ہوگا (۱۸/۳۹)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

ہمارا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی''

☆**قرآن کریم میں ہے:** وَلَا تَقْرَبَا هَـٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ (۲/۳۵)۔

''اگر تم نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے تو یہ جنتی زندگی تم سے چھن جائے گی اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھو گے''۔(مفہوم القرآن)

علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

آج 73 مذہبی فرقے اور 33 سیاسی پارٹیاں ذرائع ابلاغ سے اپنے پروگرام کی تشہیر کا بنیادی حق جمہوریت بھی مانگ رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ امن وامان بھی قائم رہے اور ان کا اسلامی تشخص بھی زندہ رہے یا للعجب! یا للعجب!

☆ **لاہور کی قدیم باغبانی**

لاہور سے محترم محمد عرفان رامح اپنے خط مورخہ 2/7/2007 میں لکھتے ہیں:

''لاہور میں ایک علاقہ باغبانپورہ ہے جو ارائیں برادری کا گڑھ ہے۔ اس علاقے نے بڑے بڑے نامور ارائیں سپوت پیدا کئے ہیں۔ آج سے صدیوں پہلے ایک شخص محمد اسحاق نامی اس علاقہ میں آ کر آباد ہوا اور اس علاقہ کا نام اسحاق پورہ رکھ دیا گیا۔ لیکن جوں جوں ارائیں برادری یا باغبان برادری کے لوگ یہاں آباد ہوتے گئے تو اس علاقہ کا نام باغبان پورہ رکھ دیا گیا جو آج تک اس نام سے موسوم ہے۔ ارائیں برادری میں عام لوگ تو کاشت کاری کرتے ہیں اور بعض لوگ پھلدار اور پھولدار پودوں/ درختوں کا کام کرتے ہیں اب مثلاً لاہور کے علاقہ مالی پورہ میں وسیع علاقہ پر گلاب۔ نرگس اور دیگر پھولوں کی کاشت ہوتی تھی اس طرح منڈی بہاؤالدین، پھالیہ، سرگودھا، شیخوپورہ، ساہیوال، ملتان اور کئی علاقوں میں ارائیں برادری کے لوگ باغبانی یعنی پھلدار درختوں اور پودوں کے فارم بنائے ہوئے تھے اور اب بھی کئی علاقوں میں باغبانی کی جاتی ہے یعنی آم، کنو، مالٹا اور لیموں وغیرہ کے فارم بنائے ہوئے ہیں۔

میں آپ کو اپنے تعارف کے سلسلہ میں صرف اتنا بتاؤں گا کہ میرا تعلق پیدائشی طور پر لاہور سے ہے اور بندہ انجمن ارائیاں (راعیاں) سے بھی منسلک رہا ہے اور میں نے پاکستان میں بسنے والے راعین (ارائیں) برادری کے علاوہ بھارت میں بسنے والی راعین برادری اور باغبان برادری سے بھی خط وکتابت کی ہے۔ بھارت کے صوبہ مہاراشٹر اور شہر ممبئی میں راعین اور باغبان برادری کی متعدد تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ جبکہ ممبئی (صوبہ مہاراشٹر) کے علاوہ صوبہ یوپی ور بہار میں جمیعت الراعین۔ باغبان ویلفیئر ٹرسٹ قائم ہیں۔ ممبئی کی تنظیم کے صدر حاجی محمد عثمان سیٹھ راعین جبکہ حاجی نیاز محمد راعی جنرل سیکرٹری ہیں۔ ممبئی کی باغبان ویلفیئر ٹرسٹ نے راعین برادری اور باغبانوں کی ایک ڈائریکٹری بھی شائع کی ہوئی ہے جو تقریباً ہر 10 سال کے بعد نئی ڈائریکٹری شائع کرتے ہیں۔''

پتہ رابطہ: (1) ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیو مری۔ (2) محمد عرفان رامح، 474، نظام بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور (ممبرشپ کی درخواست کی جاتی ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل

زبردستی

کسی بھی شخص، گروہ یا مملکت کے پاس اپنی بات منوانے کے لئے تین طریقے ہوتے ہیں ۔ ایک یہ کہ دوسروں کو دلائل و براہین کی بنیاد پر قائل کرلیا جائے۔ ان کے سامنے کسی بھی عمل کے ممکنہ اچھے یا برے نتائج رکھ دئے جائیں اور فیصلہ ان پر چھوڑ دیا جائے ۔ جو نظریات ان بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں وہ بہت مضبوط ہوتے ہیں اور دیگر افراد بھی انہیں قبول کر لیتے ہیں ۔ یہی طریق سائنسی علوم کے لئے اختیار کیا گیا ہے جو اللہ تعالی کی طرف سے اس کی کائنات میں جاری وساری ہیں ۔ اسی طرح کے اصول اللہ تعالی نے انسانوں کے معاملات کو حسن و خوش اسلوبی سے چلانے کے لئے قرآن کریم میں دیے ہیں ۔

دوسرا طریقہ کچھ شاطر قسم کے لوگ اختیار کرتے ہیں جس کے مطابق وہ کسی شعبدے بازی یا اپنے کسی طرز عمل سے لوگوں کو اپنی شخصیت کے سحر میں اس طرح گرفتار کر لیتے ہیں کہ وہ ان کی باتوں پر کسی غور وفکر کے بغیر، آنکھیں بند کر کے عمل کرنے لگ جاتے ہیں ۔ ان کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار صرف اس شخص کے فرمودات ہوتے ہیں ۔ یہ طریقہ کار اکثر مذہبی رہنماؤں کا یا سیاسی شخصیات کا ہوتا ہے ۔

تیسرے طریقے میں زبردستی، جبر، دھمکانا اور ڈرانے کا اسلوب اپنایا جاتا ہے ۔ ایسا وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس کوئی عقلی یا منطقی دلائل نہیں ہیں ۔ یا ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے ۔ غیر قانونی دھندا کرنے والے، غلط کار، متشدد مذہبی گروہ یا غیر جمہوری حکومتیں اس طریقے پر عمل پیرا ہوتی ہیں ۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ گروہوں کے آپس میں ٹکراؤ کے نتیجہ میں طاقت کا کھلا استعمال ہوتا ہے ۔ یا کچھ گروہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھتے ہیں کہ وہ حکومت سے ٹکر لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔

جب بھی قرآن کریم کے کسی اصول کی خلاف ورزی ہوگی اس کا لازمی نتیجہ افراتفری، فساد اور خون خرابے کی صورت میں نکلے گا ۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں علماء دین انہیں کہا جاتا ہے جو قرآن کریم کی تعلیمات

کے بجائے اپنے اپنے مسالک کو اہمیت دیتے ہیں اور انہیں کو صحیح سمجھتے ہوئے کسی بھی مسئلے کا حل تجویز کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نتائج تو اللہ کے قانون کے مطابق ہی نکلیں گے۔

لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں جو کچھ ہو رہا تھا اور اس کا انجام کیا ہوا' اس کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کئی احکامات کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ صحیح اور غلط کا معیار قرآن کریم کی بجائے انسانی اعتقادات کو قرار دیا گیا۔ ہر کوئی اپنی اپنی رائے دے رہا تھا۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ اس کی بات ہی ٹھیک ہے باقی بالکل غلط ہیں۔ اگر کسی سے بھی یہ مطالبہ کیا جاتا کہ اپنی بات کی تائید میں قرآن کریم کی کوئی آیت پیش کرے تو نہ کر پاتا۔ جب تک تمام فرقے قرآن کریم کی بات کو حرف آخر قرار نہیں دیں گے' ان مشکلات کا خاتمہ نہیں ہو سکے گا جن سے ملک پچھلے ۶۰ سال سے دوچار ہے۔ دوسری خلاف ورزی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی واضح ہدایت کے باوجود اپنے نظریات کے نفاذ کے لئے لال مسجد اور جامعہ حفصہ والوں نے طاقت کا استعمال کیا۔ اگر انہوں نے قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھا ہوتا تو ان کی نظر سے یہ آیات ضرور گزری ہوتیں: ''وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لآمَنَ مَن فِي الأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعاً أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُواْ مُؤْمِنِينَ'' (۱۰:۹۹) ''اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین پر موجود تمام لوگ ایمان لے آتے۔ تو کیا آپؐ لوگوں پر زبردستی کریں گے کہ وہ ایمان لے آئیں''۔ ''لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ .....'' (۲:۲۵۶) ''دین میں زبردستی نہیں ہے.....'' ''وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ.....'' (۱۸:۲۹) ''کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ سو جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر کرے''۔

تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام کا نفاذ ان لوگوں پر ہو سکتا ہے جو اس سے ناواقف ہیں یا چاہتے نہیں۔ یعنی یہ ناممکن ہے کہ حکومت اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کر دے تو سب لوگ ان پر عمل کرنا شروع کر دیں گے۔ ضیاء الحق کے دور میں اس کا تجربہ بھی لوگوں کو ہو چکا ہے کہ کسی بھی شرعی قانون کا نفاذ نہیں ہو سکا' البتہ پولیس کو رشوت کا ریٹ بڑھانے کا موقع مل گیا۔ جب تک لوگ دل سے کسی نظام کو تسلیم نہ کریں وہ خارجی ذرائع سے نافذ نہیں ہو سکتا۔ کم از کم پاکستان میں رہنے والوں کو تو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے جہاں لوگوں کی اکثریت قانون شکن ہے اور قانون نافذ کرنے والے ادارے اس سلسلہ میں مکمل تعاون کرتے ہیں۔ دنیا میں اور لوگ بھی رہتے ہیں جن ممالک میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا ہر پاکستانی خواہش مند ہے وہاں کے عوام اور حکام' سب قانون کے دائرے میں رہتے ہیں اور اس کے ثمرات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

''دینی مدارس'' کے وجود کے بارے میں لوگوں

کا تصور صحیح نہیں ہے۔علم کو دینی اور دنیاوی خانوں میں تقسیم کرنا بھی عجیب منطق ہے۔قرآن کریم میں ایسی ثنویت کا شائبہ نہیں ملتا البتہ تقابلی طور پر تو ان لوگوں کی ستائش کی گئی ہے جو کائنات کے بارے میں غور وفکر کرتے ہیں اور اس کے رموز سے پردہ ہٹا رہے ہیں۔جنہیں دینی مدارس کہا جاتا ہے وہ دراصل مختلف ''مذاہب'' کی درسگاہیں ہیں جو معاشرے کو تقسیم کرنے اور اختلافات کے فروغ دینے کا باعث بن رہی ہیں ۔ یہاں سے فارغ التحصل افراد کے سوچنے کی صلاحیت کو زنگ لگ جاتا ہے' وہ تمام حالات کو اپنی مخصوص فکر کے عدسے سے دیکھتے ہیں اور اپنے سوا سب کو غلط سمجھتے ہیں ۔ یہ سب کچھ بظاہر اسلامی ہے لیکن درحقیقت یہ قرآن کریم کی اس ہدایت کے خلاف ہے جو تمام انسانوں کو امت واحدہ بنانے سے متعلق ہے اور اس کے لئے جس فکری بنیاد کی ضرورت ہے وہ بھی اسی میں ہے۔اختلافات صرف اور صرف قرآن کریم کے اتباع و پیروی سے ختم ہوسکتے ہیں ۔لہٰذا جب تک ہم سب کا عمل اس کے مطابق نہیں ہوگا' اس ملک سے تشدد پسندی' دہشت گردی' معاشی ناہمواریاں' افراتفری اور فساد ختم نہیں ہوگا اور نہ ہی صحیح اسلامی نظام مملکت کا قیام ممکن ہے۔

THE QURAN

By

Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq

Muslims believe the Quran to be a word of God. The holy Prophet is not its author. It is, among other things, a compilation of a value system to guide those who believe in it in evolving a way of life in all spheres and at all times. The Quran claims that its suggestions are based on logic and exhorts it readers to examine its provisions in the light of reason and experience.

أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي.....

"…. I invite you to make a logical approach to the word of God. My successors will do the same …"(12/108).

Sometimes it would appear to the human mind that Quranic injunctions are not based on logic. That is not so. The fact is that human knowledge and experience is not yet mature enough to discover the logic. As scientific discoveries unfold facts in time and as humans gather more experience, they will readily admit that such injunctions were, in fact, logical all the times.

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ .....

"We will soon show them our signs in farthest regions and among their own people until it is clear to them that it is the Truth …" (41/53).

Unlike most human authors, the Quran does not take up a topic and discuss it exhaustively in one place. It brings up a point and examines it from various angles.

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَـٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا ...

"Verily We have repeated the injunctions of the Quran from various angles to enable you to comprehend them better…" (17/41).

So if anybody wishes to ascertain what the Quran has to say, for instance in respect of women rights, he would have to collect all injunctions in this respect in one chapter and understand the subject in all its aspects. This is also the aim of this attempt. Quranic value systems are listed in many chapters of the Quran and it will be my effort to collect those values under appropriate heading and then examine them logically from various standpoints. The Quran claims that whatever it states in any place, is clear and firm. There is no contradiction of any clause in another discussion of the same subject. Neither is there any cancellation of any provision.

The Quran states its value system in clear terms as well as in a symbolic language.

هُوَ الَّذِيَ أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ...

"We have revealed to you this book which has two types of provisions one clearly stated and readily understood, the other abstract truths stated in a symbolic language… (3/7).

For a correct comprehension of the symbolic passages, it is vital to know the Quranic teaching in toto. As explained above in the discussion on تصریف آیات (Repetition of injunction), Quranic injunctions are repeated in various places, sometimes as "Muhkamat" محکمات (firm and clear) and at other times as "Mutashabehat" (abstract and symbolic). People of vision interpret the symbolically stated provisions in the light of clearly متشابہات stated provisions and thus comprehend both.

The important thing to note is that if the Quran does not seem to make itself clear in one place, it has to be interpreted in the light of the same topic being discussed in another place in the Quran where it may be relatively easier to comprehend. No reference to an external book or person is necessary. The Quran explain itself. Sometimes, the topics are such, for instance the physical nature of Allah's person, if any, where symbolical language is best used to explain an abstract truth.

Quranic language is simple and clear as understood at the time at which the Quran was revealed. Some of the best Arabic poetry of that time is available in modern times in which Quranic Arabic words have been

extensively used. The Quran has around 1800 root words whose meanings are very clear in modern times. Authentic dictionaries of Arabic language like تاج العروس (Taj-ul-Uroos) and محيط المحيط (Mohit-ul-Mohit) etc. are available where the various meanings of these basic words are exhaustively discussed. For a proper comprehension of the Quran, all that is necessary is a knowledge of the Arabic language. There is no voodoo or magic or hidden meanings in the Quranic text. It means exactly what it says. However, this is a fact of life that scholars differ pretty widely in the interpretation of the Quran. There are two main reasons. The first is that scholars are of the view that in many places, the Quran does not make itself clear or complete and hence, a recourse to books other than the Quran is necessary. As this is contrary to the claim made by the Quran this reason is to be rejected out right

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

"And certainly We have made the Quran easy to comprehend. So, is there anybody who would ponder over it and get advice .." (54/17).

The second reason is that over a period of time, Quranic root words have been made to mean something which was not at all its meaning. An example would, perhaps, make this point clear. In the Arabic language, the rood word س ب ح (Sabh) means to work so hard that all parts of the body from head to foot would be used for this work. In fact, simply stated, it would mean "to work hard". Swimming is such an activity and in the Arabic language it is called سبح (Sabh). When the Prophet was told in 73/7

ان لك في النهار سبحا طويلا

"During days, you will have long hours of hard work",

he knew that with the declaration of his revolutionary Programme, he would have long days ahead in which he would have to work hard. Later on, سبح (Sabh) started to be used in terms of "telling the beads". Now, if instead of putting in a hard days work, good people just got hold of a rosary and started repeating, let us say; the names of Allah etc. The later interpreters of the Quran started asserting that this is what the Quran wanted them to do. Sure enough, hard work went by the wayside and a decline set in among peoples on account of wrong interpretation of the Quran.

Let us briefly summaries our discussion so far :-

a) Allah, and no other institution, gives broad permanent value which should govern human conduct.

b) Prophets of Allah conveyed divine message to their people. They are not the authors of this permanent value system. Remaining within the Limits of Allah, they legislate for their times in consultation with their people and tried to set up a society based on this value and law system.

c) Quran is the last revealed book of Allah. Henceforth, humanity was to obtain divine guidance from this book and continue to make detailed laws for themselves in the light of divine value system as given in it.

d) Allah's message in its original form is available in the form of the Quran. Divine value system is simply and clearly stated in this book. The Quran explains itself and does not depend on any person or institution to explain it.

It will be seen from this summary that Allah and the Rasool are very important in this whole system and they will be constantly referred to when we come to define the " Limits of Allah" in detail. Hence, a brief discussion on the part played by Allah and Rasool in this department would appear to be in order.

****

RAMADAN AND ITS BENEFITS

By

Mansoor Alam

The holy month of Ramadan is once again upon us. While most of us will be fasting and praying and seeking Allah's blessings in this month some would be spending even more time in extra prayers and remembrance of Allah. Every year Ramadan offers a kind of transcendental experience for many Muslims.

Fasting has many benefits for the body as well as for the mind. It gives the body some needed respite provided one does not indulge in the night. And the rigorous discipline and code of conduct that have to be observed daily as part of fasting and for as long as thirty days contribute to one's patience, tolerance, and overall wellbeing. These are by themselves great benefits of fasting.

But beyond that we should also strive for spiritual benefits. This month should bring out the best in us despite the controversy surrounding moon sighting. We should be kind to one another in our dealings, no matter what our differences. We must respect each other no matter what our status. We should practice to nurture these in this month as much as possible so that it becomes part of our nature for the rest of the year.

Backbiting, attaching labels, insulting one another by nicknames, spreading rumors and suspicions about others are major sins in Islam (49:11-12). So, we must avoid them --always. But since we are in a heightened spiritual state in this month we must be extra conscious not to go near them. This helps us in self-purification – one of the important goals of fasting. Also, we should be aware of those who offer short cuts to Heaven in this month. According to the Qur'an there are no short cuts to Heaven (2:214). So, we must be careful of the merchants of salvation.

Life has a serious purpose. Our time is very precious. Therefore, we should not engage in trivial talk. But it is not easy to shun it. It pervades everywhere. Without realizing we get sucked into it. So, it requires deliberate conscious effort to avoid it. Fasting helps us in this direction because we are more God-conscious

in this month than any other month. Fasting is not just for the stomach but also for the tongue. If someone wants to engage in loose talks one should simply point to fasting.

Islam is about giving and this month is especially about showing that commitment. As our duty to Islam we must help the poor and the needy, as much as we can and by all means at our disposal: by our wealth, by our knowledge, by our labor. As the Prophet (PBUH) said we should give until it hurts. If all the fortunate Muslims whom Allah has blessed sincerely practiced this pillar of Islam the poverty in the world will be greatly reduced. But our Prophet (PBUH) also established a system for this giving. No amount of giving will help in the long run until we have a unified system in place. This is a challenging task and we must work hard towards this goal especially during this month of Ramadan.

Instead of indulging in luxurious life styles the well to do among us should follow the Sunnah of our Prophet (PBUH) by living modestly. Living comfortably does not mean excessive indulgence. Caliph Othman (R) should serve as a role model for the rich among us. We are supposed to practice the injunction of the Quran: “They ask thee how much they are to spend; Say: "What is beyond your needs. (2:219).” [Translation: Yusufali]

Determining our need must be based on our capacity to use and not on our capacity to accumulate or on our capacity to fulfill socially induced desires. Following verses further amplify this situation very clearly:

> Verily, (the ends) ye strive for are diverse. So he who gives and fears (Allah), And (in all sincerity) testifies to the best,- We will indeed make smooth for him the path to Bliss. But he who is a greedy miser and thinks himself self-sufficient, And gives the lie to the best,- We will indeed make smooth for him the path to Misery; Nor will his wealth profit him when he falls headlong (into the Pit). Verily We take upon Ourselves to guide, And verily unto Us (belong) the End and the Beginning. Therefore do I warn you of a Fire blazing fiercely; None shall reach it but those most unfortunate ones Who give the lie to Truth and turn their backs. But those most devoted to God shall be removed far from it,- Those who spend their wealth for increase in self-purification. [Surah Al-Layl 92:4-18, Translation: Yusufali]

To help check our irrational passions we should try to feel the pain and suffering of our fellow human beings in the spirit of Caliph Abu Bakr (R) who kept his daily allowance equal to an average worker. On being asked as to why he was doing this he answered that he wanted to experience himself directly how an average worker was meeting his daily needs; and that if he (Abu Bakr (R)) were to find that it was hard to meet his daily needs then he would raise the allowance of the workers and that would automatically raise his allowance as well. He showed by this example what it means to be a true servant of Allah. What a beautiful world would be for Muslims – and a shining model for others – if our Muslim rulers were to emulate his example even partially?

This is the spirit of Ramadan. This is what Ramadan is all about: feeling directly for a month what millions of human beings are going through daily throughout the year, and trying our best to change their situation for the better in the long term. This *requires* that we prepare and train ourselves for this important task. The month of Ramadan is supposed to provide that training. So why not start with this Ramadan? Who knows what will happen until next Ramadan?

==========